چاہتے

اور

کسی قسم کا ڈر یا شک اپنے دل میں نہ رکھو۔ کیونکہ وہ ہم جیسے بزدلوں اور اناتھوں کی پکار سُنے گا۔ جو سب کی پالنا کرتا ہے کیا وہ آپ کی پالنا نہیں کرے گا؟ وہ کسی کو نراس نہیں کرتا۔ آپ کی پرارتھنا قبول ہو گی۔ گرے سے گرے ہوئے شخص کی قبول ہو جاتی ہے۔ یہ بات میں ذاتی تجربے سے کہتا ہوں۔ میں ایسی حالت سے گزر چکا ہوں پہلے خدا کی بادشاہت کی تلاش کرو۔ اور آپ کو سب کچھ میسّر ہو گا۔ دل کی پاکیزگی شرط ہے۔ پاک دل سے کتابوں اور اُستادوں کے حضور میں جاؤ۔ جو مانگو گے وہ ملے گا۔ اگر تم محبِ وطن بننا چاہتے ہو اور غریب ہموطنوں کی سیوا کرنا چاہتے ہو اور مظلوموں کی ڈھال بننا چاہتے ہو۔ تو دل کو ہر آلائش سے پاک کرو۔ اگر تم برمایں اپنی بہنوں اور استریوں کی سیوا کرنا چاہتے ہو۔ تو پہلے اپنے دل کو صاف کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں ضرور کامیابی نصیب ہو گی۔

تمّت

پرو فیسر پریم سنگھ نے امرت الیکٹرک پریس ریلوے روڈ۔ لاہور میں باہتمام پنڈت دھرم چند بھارگو بی۔ ایس سی چھپوا کر ٹمپل روڈ۔ لاہور سے شائع کیا۔

میں نے طالب علموں سے اکثر کہا ہے کہ وہ خبردار ہو جائیں۔ سب قسم کی کتابیں جو اُن کے ہاتھ لگ جاتی ہیں نہ پڑھیں۔ اور میں اُستادوں سے بھی کہتا ہوں کہ طلبا کے چال چلن کا خیال رکھیں۔ اور پہلے اُستادوں کو چاہیئے خود نیک بنیں۔ اور طالب علموں کیساتھ ایک قلبی رشتہ پیدا کریں۔ اصل میں تو اُستاد کا کام مدرسے سے باہر بھی ہے۔ صرف مدرسے کے اندر ہی نہیں۔ آجکل جب اُستادوں کو تنخواہیں ملتی ہیں تو وہ طلبا کو جماعت کے باہر نہیں ملتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے چال چلن پر اُستادوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اُستادوں کو چاہیئے کہ طالب علموں کو زیادہ وقت جماعت کے باہر بھی دیں۔ ورنہ کیا فائدہ ہے۔ اُستادوں کو چاہیئے طالب علموں کے دماغ اور دل دونو کی تربیت کریں۔ یاس اور نا اُمّیدی تو اُن کے نزدیک نہ آنی چاہیئے۔

میں آپ کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ رہا ہوں اور آپ تالیاں بجا کر میرے خیالات کی روانی کو نہ روکیں۔ ہمت نہ ہارو اور یہ مصمم ارادہ کرو۔ کہ تم پاکیزہ بنو گے اور ایشور کے حضور میں دست بدعا ہو گے۔ کیا آپ نے گجیندر موکھش کی کہانی سنی ہے؟ یہاں کے طلبا کو چاہیئے کہ اگر وہ اس نظم کو نہیں جانتے تو وہ اپنے ہندو تلنگی دوستوں سے سیکھیں۔ یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ نظم ہے۔

ایک تامل کہاوت مجھے یاد آتی ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے کہ

جمہوریت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو نہائت ہی موزوں ہے۔ آپ خاص حدود کے اندر جو کچھ کریں وہ درست ہے مگر حد سے گذرنا مناسب نہیں۔ اگر حد سے گذرے تو پھر آپ طالب علمی کے دائیرے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

جب آپ پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں تو اس وقت بھی طالب علم ہی ہوتے ہیں۔ چالیس سال پہلے جب میں نے پڑھنا چھوڑا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اب طالب علمی کے زمانے میں داخل ہوا ہوں آپ کو میرے تجربے سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ صرف کتابیں پڑھ لینا آپ کے لئے کافی نہیں۔ طلبا کے خط جو میرے پاس ہر جگہ سے آتے رہتے ہیں اُن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن طالب علموں نے صرف کتابیں رٹی ہیں وہ تباہ ہو گئے ہیں۔ بعضوں کے دماغ پھر گئے ہیں اور بعض بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ اور کئی تو بالکل بیر یاد اور خستہ حال ہو گئے ہیں۔ میرا دل ایسے طالب علموں کے لئے بڑا جلتا ہے جو کہتے ہیں کہ ہم شیطان کے پنجے سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہمیں کامیابی نہیں ہوتی۔ اور وہ بڑی حسرت بھری نگاہوں سے مجھ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ وہ کیا کریں؟ کس طرح نفسِ امارہ کو جیتیں؟ جب میں اُن سے کہتا ہوں کہ رام کا نام لو۔ پرارتھنا کرو اور ایشور کے سامنے سر جھکاؤ۔ تو وہ کہتے ہیں ایشور کہاں ہے؟ ہم کس کے سامنے پرارتھنا کریں؟ اُن کی یہ حالت ہو گئی ہے۔

ٹھیک کہتا ہے۔ کہ برما کے طالب علم آپس میں بات چیت کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ مجھے برما کے لوگوں سے کھدر فنڈ کے لئے کچھ نہیں لینا چاہیئے۔ بلکہ مجھے اُس روپیہ کو برما میں ہی اور برما کے لوگوں کیلئے خرچ کر دینا چاہیئے۔ اگر یہاں کوئی ایسا شخص ہے تو جلسہ ختم ہونے پر اُسے یقین ہو جائیگا۔ کہ اس روپیہ کا استعمال برما میں ہونا مناسب نہیں۔ کیا یہ آپکی شان کے شایاں ہے کہ آپ ایک شخص کو سابرمتی سے اِسلئے بلاتے ہیں کہ وہ برما میں آکر آپ کیلئے روپیہ جمع کرے اور وہ روپیہ برما میں ہی خرچ ہو؟ آپ برما میں خرچ کرنے کیلئے خود روپیہ جمع کر سکتے ہیں مجھے آپ ہندوستان کے غریبوں کے لئے اس روپیہ کو خرچ کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیجئے۔

آپ نے مجھے طالب علموں کی دنیا میں خاص اعزاز بخشا ہے جو میں لینے کا مستحق نہیں۔ مجھے دوسری عزت کی ضرورت ہے۔ اور وہ صرف ہندوستان اور برما میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے طالب علموں کا خادم ہونے کا فخر ہے۔ میں طلبا سے دنیا کے اکثر حصوں میں مِلا ہوں۔ اور اگر پرماتما نے مجھے عمر بخشی تو امید ہے کہ میں خدمت کر کے دکھلاؤں گا۔ ہندوستان میں تو ہزاروں طالب علموں کیساتھ میں نے ایک خصوصی رشتہ پیدا کیا ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہاں ہندوستانی طلبا زیادہ ہیں یا برمائی۔ اگر مجھے نسبت کا علم ہو جاتا تو اچھا ہوتا۔ مگر ہندوستانی ہوں یا برمائی جب آپ طلبا کی متحدہ

کے معنی سمجھتے ہیں۔ مگر شائد برما کے طلبا اس لفظ کے معنی نہیں جانتے درد نرائن دراصل پرماتما کے لاکھوں ناموں میں سے ایک نام ہے۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ ایشور کا کوئی نام نہیں۔ اور نہ ہی وہ ہنی ادراک میں آسکتی ہے۔ مگر وہ غریبوں کا ایشور بھی ہے اور اُن کے دل میں بھی اُسی طرح بستا ہے جس طرح اوروں کے۔ یہ نام پہلی دفعہ مرحوم دیش بندھو داس نے استعمال کیا تھا۔ یہ نام میری اختراع نہیں بلکہ مجھے دیش بندھو داس جی سے ورثہ میں ملا ہے۔ اُنہوں نے یہ لفظ میرے کام کے متعلق استعمال کیا تھا۔ جس میں البتہ چرخے کا پیغام بھی شامل تھا۔ بہت لوگ ایسے ہیں جو چرخے کے نام پر ہنس دیتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اس کا پرچار ایک وہم ہے۔ لوگ کچھ ہی کہیں مگر میں چرخے کو نہیں چھوڑوں گا۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ ایک وقت ضرور ایسا آئے گا جب لوگ ہنسی اُڑانا چھوڑ دیں گے۔ اور وہ بھی یہ پرارتھنا کرینگے کہ وہ دن جلدی آئے جب لاکھوں غریب گھرانوں میں جہاں اب بھوک اور پیاس ہے وہاں چرخہ چلے۔ جو ہندوستانی برما میں رہتے ہیں اُن کے لئے بھی میں یہ پیغام لایا ہوں۔ برما کے لوگوں سے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم کھدر فنڈ میں روپیہ دو۔ مگر ہندوستانیوں سے جو یہاں پر روزی کما رہے ہیں میں ضرور کہونگا کہ وہ اپنی کمائی میں سے غریبوں کے نام پر کچھ نہ کچھ دیں۔

ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا۔ نہیں معلوم کہانتک وہ دوست

۴۸

طلبا سے خطاب

("ینگ انڈیا" ۴ر اپریل ۱۹۲۹ء)

رنگون کے جوبلی ہال میں طلبا کے جلسے میں گاندھی جی کو ایک تھیلی اور ایک ایڈریس پیش کیا گیا۔ جس میں اُن کو نہ صرف ہند اور برما کے بلکہ ساری دنیا کے نوجوانوں کی جمہوریت کا صدر ہونے کا اعزاز بخشا گیا۔ اس جلسے میں طلبا نے یہ بھی دعوے کیا کہ جنکو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خاص حدود کے اندر جو اُنکا جی چاہے سو کریں۔ اس معاملے میں اُنہوں نے گاندھی جی سے کہا کہ وہ آشیرباد کریں۔ اور اُنہیں نصیحت دیں۔ اُس جلسے کو خطاب کرتے ہوئے گاندھی جی نے دنیا کے نوجوانوں کو مفصلہ ذیل پیغام دیا:۔

طالب علمو اور دوستو!

میں آپ کے ایڈریس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُس تھیلی کا بھی (جو روپیوں سے بھری ہے) جو آپ نے غریبوں کے (دینے دریدر نرائن) کے لیئے دی ہے۔ آپ میں سے جو ہندوستانی ہیں وہ تو دریدر نرائن

ملک میں انقلاب ہو رہا ہو تو حد لگانی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس موقعہ پر انہیں بالکل ہی پڑھنا لکھنا چھوڑنا پڑتا ہے۔ تب وہ ہڑتال نہیں رہتی وہ انقلاب ہو جاتا ہے۔ ہڑتال اور انقلاب میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کانگرسی صوبوں میں تو یہ سوال اٹھ نہیں سکتا۔ وہاں کے طلبا تو حکومت کی سب بات مانیں گے۔ اُن صوبوں میں طلبا بھی کانگرسی خیال کے ہو جایا کرتے ہیں۔ وزارت کانگرس بُری ہو طالب علم کیونکر مخالفت کریں گے؟ کانگرسی حکومت طلبا کو کیوں کہے گی کہ تم ہڑتال کرو۔ کیونکہ وہ تو خود حاکم ہیں۔ ہاں اگر حکومت کے برخلاف کوئی جنگ چھڑ جائے تو وہ دوسری بات ہے۔ اُس میں بھی تشدّد نہ ہونا چاہیئے اگر بعض حالات ایسے پیدا ہو جائیں اور طلبا کو ہڑتال کرنی پڑے تو اس سے یہ ظاہر ہو گا کہ کانگرسی حکومت کمزور ہے۔ جب سب لوگ کانگرس کے ساتھ ہوں اور کسی مظاہرے کی ضرورت پڑے تو بھی میری رائے میں طلبا کو ہڑتالوں میں شامل نہیں ہونا چاہیئے۔ ہاں نہایت مجبوری ہو تو دوسری بات ہے۔ جنگِ عظیم میں بھی طلبا سب سے آخر میں جنگ میں شامل ہوئے تھے۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں پہلے نہیں بلایا گیا تھا۔ اور وہ بھی کالجوں کے لڑکے شامل ہوئے تھے نہ کہ سکولوں کے۔



۸۷

طلبا اور ہڑتالیں

("ہریجن"- ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

بنگلور سے ایک طالب علم لکھتا ہے:-
میں نے آپ کا مضمون "ہریجن" میں پڑھا ہے۔ اور میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ طلبا اگر خاص دنوں پر مثلاً انڈمین ڈے یا ذبح خانہ ڈے والے دن ہڑتال کریں تو اچھا ہے یا نہیں؟

جواب۔ میرے خیال میں طلبا جو کچھ کہنا چاہیں کہہ سکتے ہیں اور جہاں بھی جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔ مگر اُن کو سیاسی ہڑتالوں اور مظاہروں میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے۔ طلبا جو مرضی ہو منہ سے کہیں اور جو خیالات چاہیں رکھیں اور جس سیاسی پارٹی کو پسند کرتے ہوں اُس کے ساتھ ہمدردی بھی رکھ سکتے ہیں۔ مگر جب تک وہ مطالعہ میں مشغول ہیں ایسے معاملات میں عملی شرکت نہ کریں۔ سیاسی معاملات میں شرکت کرنا اور طالب علم بھی رہنا دو کام نہیں ہو سکتے۔ ہاں جب

طلبا کو خواہ مخواہ قومی آزادی کی تحریکوں میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ اُن کے جوش کو حد سے باہر نہیں جانے دینا چاہیئے۔ تاکہ اُن کی پڑھائی میں حرج نہ ہو۔ یعنی وہ پارٹی بازی کا شکار نہ ہوں۔ مگر سیاسی معاملات میں اُنہیں رائے رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ تعلیمی درسگاہوں کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ طلبا کو پڑھائیں لکھائیں اور اُنکے چال چلن کو درست کریں۔ مگر جب طلبا کالج یا سکول کے باہر کسی سیاسی تحریک میں شامل ہوں تو وہ آزاد ہیں۔



صاحب اُمید کرتے تھے کہ بہت سے طلبا امتحان میں شامل ہو جائینگے اور جو نہ ہوں گے اُن کو سزا نہ دی جائے گی۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ پرنسپل صاحب نے وعدہ ایفا نہ کیا۔ اور یہ نوٹس لگا دیا کہ ہر ایک طالب علم کو تین روپیہ فیس دے کر امتحان میں شامل ہونا پڑے گا۔ اس سے طلبا بھڑک اُٹھے اور کہنے لگے کہ اگر پرنسپل صاحب کا یہ حال ہے تو باقیوں کا کیا کہنا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ہڑتال کر دی۔ پھر کیا تھا ہڑتال جاری رہی اور دوست اور دشمن بھی یہ کہنے لگے کہ طلبا درستی پر ہیں۔ اور اُنہوں نے بڑے صبر سے کام لیا ہے۔ جب پرنسپل صاحب اپنے لفظ پر قائم نہ رہے تو طلبا کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ہڑتال کر دیں۔ ایک اُستاد جب وعدہ ایفا نہیں کرتا تو وہ اُس عزت اور احترام کے قابل نہیں رہتا جو اُس کا اُستاد ہونے کی حیثیت میں حق ہے۔ اگر طلبا میں اِستقلال ہو تو اُن کی ہڑتال کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس نوٹس کو واپس لے لیا جائے اور ہڑتالیوں کو کوئی سزا نہ دی جائے۔ مناسب تو یہ ہے کہ حکومت کسی دوسرے شخص کو پرنسپل مقرر کرے۔

حکومت کے کالجوں میں وہ طلبا جو سیاسی خیالات رکھتے ہیں یا سیاسی جلسوں میں شامل ہوتے ہیں اکثر مشکوک رہتے ہیں۔ اور حکومت اُن کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتی رہتی ہے۔ یہ بات بالکل بند ہونی چاہیئے۔ ہمارے ملک میں غیر قوم کی حکومت ہونے کی وجہ سے

جو سکول اور کالج منظم ہیں اُنمیں ہڑتال ہونی ذرا مشکل ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی طلبا ہڑتال کر ہی بیٹھتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کالج کا پرنسپل کسی خاص خوشی منانے والے دن عوام کی مرضی کے برخلاف کالج کھولے رکھتا ہے۔ اور لڑکے اور اُن کے والدین یہ کہتے ہوں کہ کالج یا سکول بند ہونا چاہیئے تو اُس دن طالب علم اگر غیر حاضر ہو جائیں تو درست ہوگا۔ جب طلبا ہوشیار ہوتے جائیں گے تو ایسے موقعے ہمارے ملک میں زیادہ ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طلبا کے اندر قومیت کا خیال جاگتا جائے گا۔

گجرات کالج والے معاملے میں جہاں تک مجھے معلوم ہے طلبا حق پر تھے۔ اور اُنکی ہڑتال جائز تھی۔ واقعات یہ ہیں طالب علموں نے سارے ہندوستان میں سائمن کمیشن کے ساتھ عدم تعاون کرنے کے لیے ہڑتالیں کیں۔ اور کالج سے غیر حاضر ہو گئے۔ بیشک اُنہوں نے رخصت نہ لی۔ قاعدے کے مطابق طلبا غلطی پر تھے۔ اُنکو غیر حاضر ہونے سے پہلے چھٹی کی درخواست دینی چاہیئے تھی۔ مگر لڑکے آخر سب جگہ لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ اُن کے جوش کے سیلاب کو روکنا کوئی آسان کام نہیں۔ جوانی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ بہت دیر تک بات چیت ہونے کے بعد پرنسپل صاحب نے آخر معافی دے دی اور یہ طے پایا کہ طلبا تین روپے دے کر کالج کے سہ ماہی امتحان میں بیٹھ سکتے ہیں مگر یہ اختیاری بات تھی۔ جو امتحان نہ دینا چاہیں وہ نہ دیں پرنسپل

کیا ہڑتال کرنا فرض ہے؟

("ینگ انڈیا" - ۲۴ جنوری ۱۹۲۹ء)

گجرات کالج کے قریباً سات سو طلبا نے ہڑتال کر رکھی ہے۔ اور اُن کو پڑھائی چھوڑے ہوئے آج بیس دن ہونے لگے ہیں۔ یہ ایسی بات نہیں کہ اس کا اثر کالج تک ہی محدود رہے۔ اگر مزدور ہڑتال کر دیں تو بہت خراب ہے۔ مگر طلبا کا ہڑتال کرنا تو اور بھی بُرا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے کہ طلبا راستی پر ہیں یا غلطی پر۔ ہڑتالوں کا انجام اکثر خراب ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ فریقین کی عزت میں فرق آتا ہے۔ مزدور تو اَن پڑھ ہوتے ہیں۔ اور طالب علم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ بھلا اُنہیں ہڑتال کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ کوئی سرمایہ دار تو ہیں نہیں کہ مزدور اُن سے زیادہ مزدوری مانگتے ہیں۔ اُستادوں اور طلبا کا آپس میں جھگڑا کیسا؟ طالب علموں کو تو اُستادوں کا کہنا ماننا ٹھہرا۔ اُن کے ہڑتال کرنے سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اور صرف نہایت غیر معمولی حالات میں اُن کو ہڑتال کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے۔

ہے۔ چنانچہ مراسلہ نگار کے خط سے بھی ظاہر ہے اور مجھے امید ہے کہ قومی مدرسوں کے اُستاد اس بات کا خیال رکھیں گے۔ اور میری بات پر دھیان دیں گے۔ اور طلبا سے بھی کہیں گے کہ وہ صرف مہاپُرشوں کے کہنے سے ہی ایک بات کو نہ مان لیا کریں بلکہ اپنی عقل کو بھی استعمال کرنا سیکھیں۔



طور پر لکھ بھی دی ہے۔ تو بس چرخہ اور کاتنا ختم ہو جائے گا۔ چرخہ کاتنا اور بات ہے اور مجھ پر وشواس رکھنا دوسری بات ہے۔ مجھ پہ وشواس نہ ہو تو پرواہ نہیں۔ چرخہ کاتنے پر وشواس ضروری ہے۔ اگر میں کوئی غلطی کر بیٹھوں اور لوگ مجھ سے ناراض ہو جائیں یا اُن کا وشواس مجھ پہ سے کسی وجہ سے اُٹھ جائے تو بھی چرخہ کاتنا بند نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے ضروری ہے کہ لڑکے ہر کام میں جہاں تک ممکن ہو عقل سے کام لیں۔ اور چرخہ کاتنے کا معاملہ تو خاص طور پہ دلیل پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اس پر تو سارے ہندوستان کے لوگوں کی خوشحالی منحصر ہے طلبا کو چاہیئے کہ وہ یہ جانتے ہوں کہ عوام کس قدر غریب ہیں۔ اُنہیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے ملک کے گاؤں کس طرح برباد ہوتے جاتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے ملک کی آبادی کتنی ہے۔ اور ہمارا ملک کتنا وسیع ہے اور لوگ کس طرح سے اپنی آمدنی زیادہ کر سکتے ہیں؟ ملک کے غربا کے ساتھ طلبا کی پوری پوری ہمدردی ہونی چاہیئے۔ اور جن چیزوں سے اُن کے غریب ہموطن محروم رہتے ہیں وہ اُنہیں استعمال نہ کرنی چاہئیں۔ تب اُن کو پتہ چلے گا۔ کہ سوت کاتنے کا کیا فائدہ ہے؟ مہاپُرشوں کی عزت کرنے کا سوال دوسرا ہے اور چرخہ کاتنے کا سوال دوسرا ہے۔ اور مؤخر الذکر تو اقتصادی اصولوں کی بنا پر حل ہو سکتا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں بہت اندھ وشواس (کورانہ تقلید)

جواب۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس خط سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ مہان پرشوں کی عزت کرنا یا اُن پر اندھ وشواس رکھنا۔ ایسے موقعہ بھی ضرور ہوا کرتے ہیں جب کہ بغیر سبب دریافت کرنے کے حکم ماننا پڑتا ہے۔ مثلاً فوج کے سپاہی کے لئے طاعت لازمی ہے۔ کوئی قوم بھی ترقی نہیں کر سکتی جب تک اُس کے افراد حکم ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ مگر ہاں جو سماج یا سوسائٹی منتظم ہو اُس میں اِس قسم کے موافقے کم پیش آیا کرتے ہیں۔ مثلاً طلبا کو اگر ہر وقت اُستاد کا حکم بغیر سوچے سمجھے ماننا پڑے تو اچھا نہیں۔ اُستادوں کو چاہیئے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو ہر بات دلیل سے سمجھاویں۔ اور اُن کو ہمیشہ موقعہ دیں کہ وہ باتوں کو اپنی عقل سے سمجھیں۔ جہاں عقل کام نہ کرے وہاں سے وشواس شروع ہوتا ہے۔ مگر سب باتیں دلیل سے سمجھائی جا سکتی ہیں اور عقل کے معیار پر ٹھیک اُترتی ہیں۔ مثلاً اگر لڑکے یہ کہنے لگیں کہ ہم کنوئیں کا پانی جو خراب ہو گیا ہے اس لئے نہیں پیئیں گے کیونکہ کوئی مہاپرش کہتا ہے کہ مت پیئو تو اُستاد اُسکو بُرا مانیگا۔ کیونکہ عقل بھی کہتی ہے کہ جب کنوئیں کا پانی خراب ہو جائے تو اس کو اُبال کر اور صاف کر کے پینا اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اگر مدرسے کے طالب علم یہ کہیں کہ ہم تو سُوت اس لئے کاتتے نہیں کہ گاندھی جی نے حکم دیا ہے تو اُن کا ایسا کہنا ٹھیک نہیں۔ جب میں اُس مدرسے کے طلبا کے لئے مہاتما نہ رہوں گا۔ جس طرح کہ بہت سے گھروں میں اب لوگ مجھے مہاتما نہیں سمجھتے۔ اور بعض لوگوں نے تو مجھے یہ بات صاف

۴۵

مہا پرشوں کی عزت یا اندھ وشواس

("ینگ انڈیا" ۲۴ر جون ۱۹۲۶ء)

ایک اُستاد لکھتا ہے:-

ہمارے مدرسے میں کچھ لڑکے ہیں جو باقاعدہ ایک ہزار گز سوت کات کر سرب ہند چرخہ سنگ کو ہر مہینے روانہ کرتے رہے ہیں۔ اور وہ اس خدمت کو اس لیے کرتے رہے ہیں کہ اُنہیں آپ سے بڑا پیار ہے۔ اگر اُن سے کوئی سوال کرتا ہے۔ کہ تم کس لئے سُوت کاتتے ہو؟ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ مہاتما جی کا حکم ہے ہمارے لئے حکم ماننا لازمی ہے۔ بچوں کے اس خیال کو اور بھی پختگی دینی چاہیئے۔ یہ کوئی غلامی نہیں۔ یہ تو مہا پرشوں کی عزت کرنا ہے اور اُن کے حکم کو ماننا ہے۔ اب لڑکے چاہتے ہیں کہ آپ اپنے ہاتھ سے لکھ کر اُنکو کوئی پیغام دیں۔ تاکہ اُن کے دل میں اُتساہ (جوش) پیدا ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اُن کی اِس درخواست کو منظور فرمائیں گے۔

روپے پیسے کو رکھنا ایک زحمت خیال کرتے ہیں - اور اگر کچھ روپیہ مل بھی جائے تو جلدی جلدی خرچ کر دیتے ہیں - بلکہ میں نے تو اُن سے اکثر کہا کہ آپ کے ساتھ ایک محافظ ہونا ضروری ہے - وہ سُنکر ہنس دیتے ہیں اور پھر ویسے کے ویسے ہی ہو جاتے ہیں -

مادرِ ہند بھی عجیب دیوی ہے - وہ نوجوان مردوں اور عورتوں سے قربانی تو لیتی جائے گی مگر شاباش بڑی مشکل سے دیگی - اور کبھی یہ نہ کہے گی کہ اے نوجوانو اب تم آزاد ہو - ابھی تک تو ہم نے قربانی کو ایک کھیل تماشہ سمجھ رکھا ہے - سچی قربانی ابھی دُور ہے -



ہے۔ گویا اُن ہی سے اُنکی لیاقت جھکتی ہے۔ اگر ہر نوجوان کو آسانی سے کھانے پینے کو مِل جائے اور کوئی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے تو مصیبت کے وقت ایسے نوجوان بالکل گھبرا جائیں گے۔ قربانی کرنے میں بھی ایک طرح کی خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے لوگوں کے سامنے اپنی قربانی کا مظاہرہ کرنا درُست نہیں ہوتا۔ بعض قومی خُدام مجھ سے کہتے تھے کہ وہ ہر طرح کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر آخر جرح کرنے سے مجھے معلوم ہوا کہ یا تو وہ مانگ کر گذارہ کرتے ہیں یا اُن کا گذارہ چندے پر ہے۔ میں نے اُن سے صاف کہہ دیا کہ چندے مانگ مانگ کر کھاتا درُست نہیں ہے۔ جو قومی خادم ایسا کرتے تھے اُنہوں نے اقرار کیا کہ وہ کوئی قربانی نہیں کر رہے۔ بہت سے نوجوانوں نے بڑی ملازمتیں چھوڑی ہیں بے شک یہ اچھی بات ہے اور قابلِ تحسین ہے۔ مگر یہ بھی کوئی بڑی قابلِ تعریف بات نہیں۔ قربانی تو وہ ہے جو خوشی سے کی جائے۔ قربانی بھی کرنا اور دل میں رنجیدہ ہونا بھی اچھا نہیں۔ قرُبانی ایک متبرک جذبہ ہے۔ وہ کیا قربانی ہوئی جو تعریف کی خواہاں ہو۔ مہاتما بدُھ کی طرف دیکھئے سب کچھ خوشی سے تیاگ دیا۔ کوئی چیز بھی اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اُنہیں ایک بوجھ سا معلوم ہوتا تھا۔ لوکمانیہ تلک مہاراج غریب ہی رہے۔ کیوں کہ دولت اُنہیں دُکھ دینے والی معلوم ہوتی تھی۔ اینڈریوز[1] صاحب

---

[1] Andrews

بہت بڑا سمجھنے لگے ہیں اور یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ "ہمچو ما دیگرے نیست"۔

میری رائے میں اپنے بوڑھے عمر رسیدہ والدین کی خدمت ہر ایک کا فرضِ منصبی ہے۔ اگر وہ والدین کی خدمت نہیں کر سکتے تو اُن کے لیئے مناسب ہے کہ وہ شادی نہ کریں اور مجرّد رہیں۔ بلکہ کسی قومی خدمت کو اپنے سر پر نہ لیں۔ جب تک پہلے اس خدمت کو بجا نہ لائیں۔ خود بھوکے رہیں مگر والدین کے لیئے کھانے پینے اور پہننے کا بندوبست کریں۔ مگر نوجوانوں کو جاہل اور بے سمجھ والدین کی اطاعت کرنے کی ضرورت نہیں۔ بعض والدین اپنی اولاد سے کھانے پینے کے لیئے روپیہ نہیں لیتے بلکہ اس لیئے روپیہ لیتے ہیں کہ لڑکیوں کی شادی پر فضول طرح سے خرچ کر ڈالیں۔ میری رائے میں قومی خدّام کو اس مد میں روپیہ دینے سے انکار کر دینا چاہیئے۔ ہاں مگر نرمی سے انکار کرنا چاہیئے۔

مجھے تو ابھی تک کوئی ایسا قومی خادم نہیں ملا جو بھوکا مرا ہو۔ ہاں بعضوں کو ذرا معمول سے کم کھانے پینے کو ملتا ہے بعض لوگ اُن میں ایسے بھی ہیں جو لیاقت کے لحاظ سے زیادہ کے مستحق ہیں۔ مگر جوں جوں وہ خدمت زیادہ کرتے ہیں اور اُن کی لیاقت کا پتہ لگ جاتا ہے۔ تو انہیں سب کچھ ملنے لگتا ہے۔ اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی مشکلات اور مصائب جھیل کر ہی تو انسان مضبوط ہوتا

پہلے والدین اور پھر قومی خدمت

("ینگ انڈیا"۔ ۲۵ر جون ۱۹۲۵ء)

جب میں بنگال میں دورہ کر رہا تھا تو میرے کانوں تک ایک عجیب خبر پہنچی۔ کہ ایک قومی ادارے کے رہنے والے یہ کہہ رہے تھے کہ اُن کا پہلا فرض قوم کی خدمت کرنا ہے اور بعد میں والدین کی خدمت۔ اور اُن کا یہ بھی کہنا تھا۔ کہ میں بھی ایسا ہی کہتا ہوں۔ اگر "ینگ انڈیا" میں کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جس سے یہ خیال پیدا ہوگیا ہو۔ تو میں ناظرین سے معافی کا طلبگار ہوں۔ مگر جہاں تک میں جانتا ہوں میں نے ایسا نہیں کہا۔ میں تو جو کچھ بھی بنا ہوں۔ وہ اپنے والدین کی بدولت بنا ہوں۔ میرا تو بالکل شروَن کمار جیسا رویّہ اپنے والدین کی طرف رہا ہے۔ جب میں نے ایسا سُنا تو مجھے بڑا دُکھ ہوُا۔ اور میں نے اپنے غُصّے کو مشکل سے روکا۔ جو نوجوان ایسا خیال دل میں لائیں گے۔ وہ ٹھیک راستے پر نہ ہوں گے۔ مگر آج کل نوجوانوں میں عام قاعدہ ہوگیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو

تو کوئی نہ کوئی ایسا راستہ نکل ہی آئے گا جو ہمارے ماحول کے مطابق وموافق ہوگا۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ جس چیز سے لاکھوں ہموطن محروم رہ جاتے ہیں وہ ہم خود بھی اختیار کرنے سے انکار کریں۔ یہ کام فوراً تو نہیں ہوسکتا۔ پہلے تو یہ ارادہ کرنا ہوگا کہ جو چیز ہمارے ہموطنوں کو میسّر نہیں وہ ہم بھی نہیں لیں گے۔ اور دوسرا قدم یہ ہے کہ ہم اپنی طرزِ معاشرت کو اس خیال کے زیرِ اثر بدل ڈالیں۔ عوام تو تب ہی ترقی کرینگے جب ہم میں سے اکثر اِس قسم کے اِیثار اور قربانی کیلئے تیار ہوجائینگے۔ اور بغیر اس کے سوراج کیسے مل سکتا ہے؟ جس نسبت سے ہم غریبوں کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار ہوجائیں گے۔ اُسی نسبت سے سوراج کے نزدیک ہوتے جائیں گے۔



کو آراستہ کیا جائے۔

اصلاح تو اندر کی ہونی چاہیئے۔ قربانی اور ایثار کا جذبہ اُبھارنا چاہیئے۔ ملک کی ضرورت کے مطابق قربانی ہونی لازمی ہے۔ گھروں میں جو لوگ اچھے بھلے ہیں وہ کیوں کام کر کے روزی نہ کمائیں؟ بہت سے توہمات اور بے معنی رسومات پر خرچ کرنے سے کیا فائدہ؟ برادریوں کو کھانے کھلانے اور شادیوں پر فضول خرچ کرنا بھلا ان سے کیا حاصل۔ جب کبھی کسی خاندان میں شادی یا غمی ہوتی ہے بیحد خرچ ہو جاتا ہے۔ اور بوجھ پڑتا ہے۔ ایسا کرنا کوئی قربانی میں داخل نہیں۔ یہ تو حماقت ٹھہری۔ اس کی روک تھام کے لئے دلیری اور ہمت درکار ہے۔

ذرا غور کیجئے۔ تعلیم پر کسقدر خرچ ہو رہا ہے۔ لاکھوں تو بھوک سے مر رہے ہیں۔ اس قدر خرچ کر کے اپنے نواحقین کو تعلیم دینے کے کیا معنی؟ دماغ تو کام کاج کرنے سے نشوونما پاتا ہے نہ کہ سکولوں اور کالجوں میں پڑھنے سے۔

جب ہم یہ فرضی اعلیٰ تعلیم دینا چھوڑ دینگے تو اصلی معنوں میں اعلےٰ تعلیم ہم میں شروع ہوگی۔ کیا ہم کوئی ایسا طریقہ نہیں نکال سکتے جس میں طلبا اپنی تعلیم کا خرچہ اپنی محنت سے نکال سکیں۔ ممکن ہے ایسا کوئی راستہ نہ ہو۔ لیکن بلا شبہ اگر ہم یہ مہنگا طریقہ تعلیم چھوڑ دیں اور یہ بھی جانتے ہوں کہ اعلےٰ تعلیم کا ہونا لازمی ہے

کہ لوگوں کا گذارہ مشکل سے ہوگا۔ دونو حالتوں میں خرابی ہی ہوگی۔
چونکہ ہماری ضروریات تو بڑھ رہی تھیں اور آمدنیاں اُسی نسبت میں نہ بڑھتی تھیں اسی واسطے عدم تعاون کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ یہ عدم تعاون انگریزوں کے ساتھ نہ تھا بلکہ اُس طرزِ حکومت کیساتھ تھا جس نے ہمیں سانپ کی طرح اپنی لپیٹ میں جکڑ رکھا تھا۔ اور ہمارا ستیاناس کر دیا تھا۔ اس طرزِ حکومت کی وجہ سے ہی ہماری ضروریات بڑھ گئی تھیں۔ اور ہمارے ملک کی حالت بڑی غریبی کی ہو گئی تھی۔ اور چونکہ ہم دوسرے ملک کے لوگوں کو لوٹتے گھسوٹتے نہ تھے اس لئے جوں جوں متوسط طبقے کے لوگ زیادہ ہوتے گئے جو تجارت کرتے تھے۔ غریبی بڑھتی گئی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں تو بالکل تباہ ہی ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں یہ نظارہ ہمارے سامنے تھا۔ روک تھام والی تدبیر ابھی بالکل نئی ہے۔ اُسے چلنے دیجئے اور جلدی نہ کیجئے۔
ہماری ضرورتوں کا بڑھ جانا ہمارے لئے بڑا ہی مُضر ثابت ہُوا ہے۔ مغربی طرزِ معاشرت نے تو اور بھی خرابی کی ہے۔ مشرقی طرزِ معاشرت بڑا سنگین سا ہو گیا تھا۔ اُس میں کوئی خوبی باقی نہ رہ گئی تھی۔ خرابی پر خرابی ہوتی چلی گئی۔ اب ہماری قربانی اور ایثار بھی اُسی درجے کا ہونا چاہیئے۔ پہلے حالت اندر سے سُدھرے تو کام چلے۔ باہر کی نمائش سے کیا ہوگا۔ اگر اندرونی حالت بگڑی ہوئی ہو۔ تو ظاہری طرزِ حکومت کے بدلنے سے وہی معاملہ ہوگا جیسے ایک

قربانی یا ایثار

("ینگ انڈیا" ۲۴ر جون ۱۹۲۶ء)

میرے پاس چند نوجوانوں کے خط موصول ہوئے ہیں جن میں وہ اس بات کی شکائت کرتے ہیں کہ اُن کی ذمہ واریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ مگر اُن کی تنخواہیں اس قدر قلیل ہیں کہ اُن کا گذارہ ہونا مشکل ہوگیا ہے۔ ایک نوجوان لکھتا ہے کہ اُسے نوکری چھوڑ کر کہیں سے قرضہ لے کر یا مانگ کر یورپ جانا ہوگا۔ تاکہ اُسے پہلے سے بہتر ملازمت ملے دوسرا کسی اور ملازمت کی تلاش میں ہے۔ ایک اور نوجوان لکھتا ہے کہ اگر سرمایہ ہوتا تو وہ کوئی تجارت وغیرہ شروع کر دیتا جس میں کچھ کمائی ہوتی۔ یہ نوجوان بڑے ہی دیانتدار ہیں اور صحیح دماغ رکھتے ہیں۔ اور ہر طرح سے قربانی یا ایثار کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر کیا کریں گھر کی ضروریات بڑھ گئی ہیں۔ کھدر اور قومی تعلیم وغیرہ اُنکو پسند نہیں۔ ملازمتوں میں ترقی ملنی مشکل ہے۔ اگر یہی حال رہا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو لوگ نوکریاں چھوڑ دیں گے یا ضروریات اِتنی بڑھ جائیگی

کا نہ نکال لے۔ اگر آپ روزانہ ڈائری لکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ سال بھر میں آپ کس قدر قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔ اگر آپ تعلیم سے کچھ فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں تو یہ اچھوت اُدھار کا کام کیجئے۔ اب تو کام جاری ہے۔ طلبا وار دھا کے ارد گرد پانچ میل کے حلقے میں ہری جنوں کی خدمت کا کام سر انجام دے رہے ہیں۔ وہ چپکے سے کام کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو پتہ نہیں چلتا۔ آپ وہاں آیئے اور ہمارے کام کو دیکھئے۔ کام ہے تو بڑا سخت مگر بڑا مزیدار ہے۔ آپ کو کرکٹ[1] اور ٹینس[2] سے زیادہ خوشی دے گا۔ میں نے تو بہت دفعہ کہا ہے کہ اگر کام کرنے والے ہوں تو روپیہ مل ہی جائے گا۔ میں اٹھارہ برس کا تھا جب سے میں نے مانگنے کا کام شروع کیا ہے۔ میرا تو یہ تجربہ ہے کہ کام کرنے والے ہوں تو روپیہ آجاتا ہے۔ روپیہ سے میری تسلی نہیں ہوتی۔ آپ کو تو چاہیئے کہ کچھ وقت ہری جنوں کی خدمت کے لئے دیں۔ جیسا کہ جناب صدر نے فرمایا ہے۔ میں خیال کی دنیا میں رہتا ہوں مگر میں خیالوں کو عملی شکل دیتا ہوں۔ میں خیالی پلاؤ نہیں پکاتا رہتا۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے میں خیالوں کو عملی جامہ پہناتا ہوں۔ جو عطیے آپ نے دیئے ہیں اُنہیں اب نیلام کر کے روپے وصول کرتا ہوں۔

۱۔ Cricket ۲۔ Tennis

رہتا ہوں۔ اور پہلے کبھی کسی طلبا کے جلسہ میں میری اس قدر حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ مگر مجھے آپ سے اِس سے بھی زیادہ اُمید ہے۔ اگر مجھے فرصت کے وقت میں مددگار مل جائیں تو بہت کام ہو سکتا ہے۔ مزدوروں سے یہ کام نہیں ہُوا کرتا۔ مزدوری دیکر ہم ہریجنوں کی بستیوں میں جاکر اُن کی سڑکیں صاف نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اُن کے گھروں میں جاکر اُن کے بچوں کو نہلا دھلا سکتے ہیں "ہری جن" اخبار میں مَیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ طلبا کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک ہری جن اُستاد لکھتا ہے کہ اچھوت اُدھار کا کام نہائت ہی مشکل ہے۔ وحشی قوموں کے بچے ہری جنوں کے بچوں سے کہیں بہتر ہیں۔ مؤخّر الذکر تو بالکل گئے گذرے ہیں۔ وحشی بچّے تو کہیں صاف رہتے ہیں۔ یہ تو نہائت غلیظ ہیں۔ مزدور وہاں کیا کر سکتے ہیں۔ چاہے ہم کتنا ہی روپیہ خرچ کیوں نہ کریں کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو آپ کے کرنے کا کام ہے سکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم آپ نے حاصل کی ہے اُسکا امتحان تو اب ہوگا۔ انگریزی میں ایک صحیح تقریر کرنا کوئی بہادری نہیں۔ آپ کی لیاقت کا امتحان تو اس میں ہے کہ آپ غریبوں کی کس قدر خدمت کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کو ساٹھ روپے کی یا چھ سو روپے کی ملازمت مل گئی تو کیا ہوگا۔ آپ اس طریقے سے خدمت کیجئے۔

کیا کوئی طالب علم بھی ایسا نہ ہوگا جو دِن بھر میں ایک گھنٹہ فرصت

دل سے یہ خیال دُور ہو جائے تو ہمیں بالکل ہوش آ جائے اور ہماری آنکھیں بالکل کھُل جائیں۔ بنی نوع انسان کو اچھُوت پن کے ہٹ جانے سے جو فائدہ ہوگا اُس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اب شاید آپ سمجھ جائیں گے کہ میں کیوں صرف اس خیال کے پیچھے اپنی عمر ضائع کر رہا ہوں۔

اگر طلبا جو یہاں جمع ہیں میرے مطلب کو سمجھ گئے ہوں۔ اور یہ بھی جان گئے ہوں کہ میرا مقصد کیا ہے تو اُمید ہے کہ وہ میری مدد کریں گے۔ بہت سے طلبا نے مجھے خط بھی لکھے ہیں کہ وہ اچھُوت اُدھار کے کام میں کیا مدد کر سکتے ہیں۔ مجھے تو اس بات کی حیرانی ہے کہ وہ ایسا سوال کیوں کرتے ہیں۔ خدمت کا میدان تو بڑا وسیع ہے۔ یہ پوچھنے سے کیا فائدہ کہ ہم یہ کریں یا نہ کریں۔ آخر یہ کوئی سیاسی مسئلہ تو نہیں۔ فی الحال تو اس سوال کا سیاسات سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں کل کو بن جائے تو خبر نہیں۔ میری زندگی تو دھارمک زندگی ہے۔ میری سیاست کا انحصار تو دھرم پر ہے۔ جب میں نے سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا تو بھی میں نے دھارمک اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اچھُوت اُدّھار کا کام تو بھلائی کا کام ہے۔ طلبا کو اپنا فرصت کا وقت ہریجنوں کی خدمت میں خرچ کرنا چاہیئے۔ مجھے یہ شاندار تھیلی جو آپ نے عطا کی ہے وہ آپ کی ہمدردی کا ثبوت ہے۔ میں سارے ہندوستان میں گھومتا

میں یہ بات آجائے تو آپس کی دشمنی اور عناد بھی بند ہو جائے۔ اور دنیا میں امن قائم ہو جائے۔ آپ لوگوں نے درست فرمایا ہے کہ اچھوت پن کے برخلاف جو آواز میں نے اٹھائی ہے وہ صرف ہندوؤں تک ہی محدود نہیں۔ میں نے تو کئی بار کہا ہے کہ اگر ہندوؤں کے دلوں سے یہ بیماری دور ہو جائے تو اس کا اثر دور تک پہنچے گا۔ کیونکہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ جیسا میں نے کل رات بھی طلبا کے جلسے میں کہا تھا۔ کہ اگر اچھوت پن کا خیال ہر اونچی ذات والا ہندو اپنے دل سے اچھی طرح نکال دے تو ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ دراصل خواہ ہم ہندو ہیں یا مسلمان۔ عیسائی ہیں یا پارسی ہم اور نہیں اور وہ اور نہیں۔ ہم اس وقت اپنے آپ کو ایک سمجھنے لگیں گے۔ جب یہ خیال دل میں نہ ہو گا۔ جیسا میں نے بہت دفعہ کہا ہے یہ اچھوت پن کا دیو ہزار سر رکھتا ہے۔ اور کئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اور انسان کو اکثر دھوکا لگ جاتا ہے۔ مثلاً اگر میرے دل میں کسی کے لئے نفرت ہے تو یہ بھی ایک طرح کی بیماری ہے۔ کیا معلوم جیتے جی میرا یہ خیال پورا ہو نہ ہو۔ یعنی اچھوت پن مکمل طور پر ہٹے یا نہ ہٹے۔ وہ لوگ جو دھارمک ہیں یعنی جو دھرم کے بیرونی لوازمات سے ہی نہیں بلکہ اس کی روح سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اچھوت پن جو مختلف شکلوں میں رونما ہوا کرتا ہے بالکل دور ہو جانا چاہیے۔ اگر ہندوؤں کے

۴۷

طلبا اور ہریجنوں کی خدمت

("ہری جن" ۱۷ر نومبر ۱۹۳۳ء)

ناگپور میں طلبا کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا:-

میرے متعلق جو کچھ آپ نے کہا ہے اگر اُسے سچ مان لیا جائے تو نہ معلوم میں کہاں کا کہاں ہوتا۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ میں کیا ہوں۔ میں اپنے ملک کا ایک غریب خادم ہوں۔ اور ملک کی خدمت کرتے ہوئے میں کل بنی نوع انسان کی خدمت بھی کرتا ہوں۔ مجھے بچپن میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ دو خدمتیں متضاد نہیں ہیں۔ جب میں بڑا ہوا اور زیادہ سمجھدار ہوتا گیا تو یہ خیال پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا۔ اور پچاس سال کی قومی خدمت کے بعد بھی میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنے ملک کی خدمت کرتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں لینی چاہیئے کہ وہ باقی نوع انسان کی خدمت نہیں کرتا۔ اصولاً یہ بات درست ہے۔ اگر مختلف اقوام کی سمجھ

یہ رویہ اچھوتوں کے ساتھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ وہ اس بات کو سنیں نہ سنیں مضائقہ نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے متعلق اچھی کتابیں بھی بانٹ سکتے ہیں۔ تاکہ بات صاف ہو جائے۔ جو لوگ اچھوت پن ہٹانا چاہتے ہیں اُن کی فہرستیں طلبا تیار کر سکتے ہیں۔ اور اُن لوگوں کی بھی جو ہٹانے کے برخلاف ہیں۔ ایسی فہرستیں تیار کرتے ہوئے وہ یہ بھی دریافت کریں کہ کہاں کہاں ہریجنوں کو کنوؤں۔ مدرسوں۔ تالابوں اور مندروں میں جانے کی اجازت ہے اور کہاں اجازت نہیں ہے۔

اگر طلبا اس کام کو باقاعدہ اور ہمت کے ساتھ کریں تو اُنکو کئی باتوں کا پتہ لگ جائے۔ ہر طالب علم کے پاس ایک کھاتہ رہنا چاہیئے۔ جس میں یہ سب باتیں درج ہوں۔ اور جب تعطیلیں ختم ہو جائیں تو وہ ایک مکمل مگر مختصر رپورٹ تیار کریں۔ جو وہ اپنے صوبہ کے ہریجن سیوک سنگ کو روانہ کر دیں۔ دیگر طلبا چاہے اِن سفارشات کو قبول کریں یا نہ کریں۔ مگر مجھے امید ہے کہ مراسلہ نگار صاحب ضرور مجھے مطلع کریں گے کہ اُنہوں نے اور اُن کے ساتھیوں نے اِس شعبے میں کیا کچھ کیا ہے۔



اور تفریح کیلئے لے جایا جائے۔ اور انہیں قدرت کے کارنامے سمجھائے جائیں۔ اور ارد گرد کی چیزوں میں دلچسپی لینا سکھلایا جائے۔ اس طرح سے انہیں کچھ تاریخ اور جغرافیہ بھی آجائے گا۔

۴۔ رامائن اور مہابھارت سے اُن کو سادہ کہانیاں سنائی جائیں

۵۔ سادے بھجن بھی ہری جنوں کو سکھلانے چاہئیں۔

۶۔ ہری جنوں کے بچوں کو نہلا دھلا دیا جائے تاکہ وہ صاف ستھرے رہ سکیں اور پھر چھوٹے اور بڑے بچوں کو صفائی وغیرہ کے متعلق موٹی موٹی باتیں بتلا دی جاویں۔

۷۔ کچھ علاقے مقرر کر کے وہاں ہری جنوں کے متعلق مفصّل تحقیقات کی جائے کہ اُن کا کیا حال ہے۔

۸۔ جو ہری جن بیمار ہیں اُن کے لئے دوا وغیرہ کا بندوبست کیا جاوے۔

مفصّلہ بالا ہدایتیں نمونے کے طور پر دی گئی ہیں۔ اِن سے ظاہر ہے کہ ہری جنوں میں کس قدر کام ہو سکتا ہے۔ یہ فہرست جلدی میں تیار کی گئی ہے مگر سمجھدار طالب علم اس میں کچھ بڑھا بھی سکتا ہے۔

طالب علم صرف ہری جنوں کی ہی خدمت پر اکتفا نہ کریں۔ وہ دوسری ذاتوں کے ہندوؤں کی بھی سیوا کر سکتے ہیں۔ مثلاً طلبا بڑی نرمی سے بڑی ذاتوں کے ہندوؤں سے کہہ سکتے ہیں کہ انکا

ہے۔ اور اگر وہ نفسانی لذتوں سے پرہیز کریں اور تھالی میں کچھ باقی نہ رکھنے کی عادت ڈالیں تو اُنکا بہت سا خرچ بچ جاوے۔ اور ہریجنوں کو بھی بہت کچھ اس خوراک سے جو اُن کے لئے بنتی ہے مل جائے۔

ایسا کرنے کے بعد بھی طالب علموں کو ہریجنوں کو ایسا سمجھنا چاہیئے کہ وہ اُن کے خویش و اقارب ہیں۔ اُن سے بڑی محبت سے پیش آنا چاہیئے۔ اور اُن کو بتلانا چاہیئے کہ ایسی بُری عادتیں (مثلاً بچا کھچا کھانا) چھوڑ دینی چاہیئں۔ اور دیگر اصلاحیں بھی اُنکے لئے لازمی ہیں۔

رہا گرمی کی تعطیلیں گذارنے کا سوال۔ اگر طلبا غور کریں اور اُن میں ہمت ہو تو وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ چند ایک باتیں ذیل میں درج ہیں:۔

۱۔ ایسے مدرسے جاری کریں جہاں دن کو اور رات کو بھی ایک مقررہ کورس جو محنت سے تیار کیا جاوے پڑھایا جائے اور یہ کورس تعطیلوں کے اندر ہی ختم ہو جانا چاہیئے۔

۲۔ جہاں ہریجن رہتے ہیں وہاں جاکر اُن کے گھروں کو صاف کیا جاوے اور اس میں ہریجنوں سے بھی مدد لی جاوے۔ اگر وہ مدد دیں تو۔

۳۔ ہریجنوں کے بچوں کو یا ہر گاؤں کے نزدیک کھیل کود

جواب۔ مراسلہ نگار نے جو مُشکل پیش کی ہے۔ وہ ہے تو بڑی اہم۔ ہری جنوں کو بچا کھچا کھانا لینے کی اس قدر عادت پڑ گئی ہے کہ وہ ایسے موقعوں کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ اگر ان کو اس قسم کا کھانا نہ دیا جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی بڑی حق تلفی ہوئی ہے۔ مگر یہ افسوسناک حالت اس بات کو بتلاتی ہے کہ بڑی ذاتوں کے ہندو اور اچھوت ذاتوں میں کس قدر گراوٹ رونما ہو گئی ہے۔ طالب علموں کو اس بات کی بالکل پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ کہ اور جگہ کیا ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ راستی پر ہیں یا نہیں۔ اور اگر راستی پر ہیں تو پکے ہوئے کھانے میں سے کچھ ہری جنوں کو دیں۔ ڈیرہ دون والے طالب علم نے خرچ کے سوال کو لیا ہے۔ مجھے بھی بورڈنگ ہاؤسوں کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ طلبا ضروری چیزوں کے علاوہ لذیذ کھانوں پر بہت خرچ کر دیتے ہیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ طلبا اپنی تھالیوں میں ضرورت سے زیادہ کھانا باقی چھوڑ دیتے ہیں۔ میری رائے میں تو اُنہیں تھالی میں کچھ بھی باقی نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں غریبوں کی کچھ پرواہ نہیں۔ کسی شخص کو اور خاص کر طالب علموں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ کھانا اپنی تھالی میں ڈلوائیں اور اُنہیں یہ بھی نہیں چاہیئے کہ اچھے اچھے اور لذیذ کھانے بنوا کر کھائیں۔ طالب علمی کے زمانے میں تو اُنہیں اپنے اوپر قابو پانا سیکھنا

طالب علم اور موسم گرما کی رخصتیں

("ہریجن" - یکم اپریل ۱۹۳۴ء)

ذیل میں ایک ہندی خط کا خلاصہ جو ایک طالب علم نے ڈیرہ دون سے تحریر کیا ہے درج کیا جاتا ہے :-

ہمارے کالج کے بورڈنگ ہوس میں بھنگی اب تک بچا کھچا کھانا لے لیا کرتے تھے۔ جب سے ذرا ہم ہوشیار ہو گئے ہیں ہم نے اس رواج کو بند کر دیا ہے اور اب اُنہیں صاف دال اور روٹی دیتے ہیں۔ بھنگی (ہریجن) اس طریقے کو پسند نہیں کرتے۔ بچے ہوئے کھانے میں تو اُنہیں کچھ گھی اور اچھے اچھے کھانے وغیرہ بھی مل جایا کرتے تھے۔ طالب علم اُنہیں سب چیزیں کیسے دے سکتے ہیں۔ ایک اور بھی مشکل ہے۔ ہم تو اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ہریجن بچا کھچا کھانا پھر بھی نہیں چھوڑتے۔ خاص کر کے ذات برادریوں کے جب بڑے بڑے کھانے ہوتے ہیں تو وہ ضرور لیتے ہیں۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آپ یہ بھی بتلایئے۔ کہ تھوڑے دنوں میں ہمیں گرمی کی تعطیل ہو جائے گی۔ ہم اُن دنوں کیا کریں؟

کا پتہ بھی نہیں۔ کچھ تھوڑے ہی ہونگے جو ان طریقوں کو عمل میں لاتے ہیں۔ وہ لاکھوں تو اس فکر میں ہیں کہ اگر بچے زیادہ ہوگئے تو وہ کیا کریں گے۔ پہلے تو بچے پیدا کرتے جانا اور پھر اُن کی پرورش سے گریز کرنا یہ کہاں کی بہادری ہے؟ جو لوگ حمل روکنے کے لئے ادویات استعمال کریں گے وہ کس طرح اپنے جذبات پر قابو پا سکتے ہیں اوّل تو وہ اس کا احساس ہی نہیں کریں گے۔ اور اگر اُنہوں نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور ساتھ ساتھ دوائیاں بھی استعمال کرتے گئے تو بس میاں بیوی دونو کی صحت کا ستیاناس ہو جائے گا۔ اور مرد کو عورت کی نسبت زیادہ نقصان ہوگا۔

نفسِ امارہ کے ساتھ جنگ نہ کرنا ایک طرح کی بُزدلی ہے۔ مراسلہ نگار کے لئے تو اور کوئی راستہ ہی نہیں سوائے اِس کے کہ وہ اپنے جذبات پر پورا پورا قابو رکھے۔ اگر پہلے پہل ناکامیابی بھی ہو تو کیا مضائقہ۔ جنگ میں بھی ایک طرح کا مزا آتا ہے۔ کامیابی تو ایشور کے ہاتھ ہے۔ اور اُس کی مہربانی سے ہوسکتی ہے۔



کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی تو اُن کی عمر بارہ برس سے بھی کم ہے اتنے برس پہلے ہی واویلا کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اگر ذرا غور کیا جائے تو اُسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ بہنیں اپنا خاوند خود پسند کر سکتی ہیں اور شادی پر بھی پانچ روپے خرچ کرنے سے کام چل سکتا ہے۔ میں نے تو کئی ایسی شادیاں دیکھی ہیں۔ اور وہ لوگ بھی پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے تھے۔

مجھے تو افسوس ہے کہ اس طالب علم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کاتنا کہاں جا کر سیکھے۔ خود لکھنؤ میں کئی ایسے نوجوان ہوں گے جو اسے کاتنا سکھلا دیں گے۔ بلکہ کاتنے کے علاوہ کچھ اور بھی سیکھے۔ گاؤں میں تو اب ہر مرد اور عورت صرف کاتنے سے ہی اپنی روزی کما لیتا ہے۔ عاقل کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

اب رہا حمل کو روکنے کا سوال۔ یہ مشکل بھی خیالی معلوم ہوتی ہے۔ اگر بیوی پڑھی لکھی نہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ آخر عورتیں سمجھدار ہوتی ہیں۔ اگر خاوند کہے کہ میں شہوانی جذبے کو قابو میں رکھنا چاہتا ہوں تو وہ بھی ضرور مان جائے گی۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ خود تیار ہے یا نہیں۔ جہانتک میں جانتا ہوں مرد کو اپنے اوپر قابو نہیں ہوتا۔ عورت تو اپنے کو قابو میں رکھ سکتی ہے۔ مگر مجھے اس سے کیا مطلب طالب علم کو خود چاہیئے کہ وہ سوچے کہ اگر بچے زیادہ ہو گئے تو انکی تربیت کیونکر ہو سکے گی۔ لاکھوں کو تو حمل کے روکنے کی دوائیوں

ظاہر ہے کہ وہ بھی قصوروار ہے اور طریقۂ تعلیم بھی نہائت ہی خراب ہے۔ تعلیم کو ایک تجارت یا روپیہ کمانے کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ دراصل تعلیم کا مقصد دوسرا ہے۔ اگر یہ طالب علم اپنے آپکو اپنے لاکھوں ہموطنوں میں سے ایک خیال کرے تو اُسکو معلوم ہو جائے کہ وہ بھی اپنے ہم عمروں کی طرح بے بس ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ بھلا وہ اکیلا کیوں سارے کنبے کے پالنے کی ذمہ واری اپنے سر پر لے؟ اگر کچھ رشتے دار صحت ور بھی ہیں اور کافی عمر کے بھی ہیں تو اپنی روزی خود کیوں نہ کمائیں؟ گھر میں اس قدر نکھٹو کیوں ہوں؟

ایک علاج اور بھی ہے۔ طالب علم کو چاہیئے کہ جو کچھ اُس نے پڑھا ہے اُس میں سے بہت سا بھول جائے۔ تعلیم کے متعلق اُسے اپنے خیالات کو بدلنا چاہیئے۔ اوّل تو بہنوں کو یہ مہنگی تعلیم دینے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ تو باقاعدہ کسی دستکاری کو سیکھیں اُن کا دماغ بھی اچھا ہو جائے گا۔ اور دستکاری سیکھنے سے دماغ اور جسم دونو نشو و نما پائیں گے۔ اور اگر وہ یہ خیال کریں کہ انہیں تو بنی نوع انسان کی خدمت کرنی ہے کوئی اپنا گھر تو نہیں بھرنا تو اُن کا دل یعنی روح بھی ترقی پذیر ہو گا۔ بھائی اور بہنیں اس طرح سب مل کر روزی کمائیں گے۔

اس خط میں بہنوں کی شادی کرنے کا بھی ذکر ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ جلدی شادی بھی کرنی ہو گی بیس سال سے پہلے شادی

مجھے یہ پتہ نہیں لگتا کہ کیا کروں اور کس جگہ سے شروع کروں میری تعلیم صرف کتابی اور حسابی سی رہی ہے۔ کئی دفعہ دل چاہتا ہے کہ کاتنا سیکھوں۔ آپ کا بتلایا ہوا علاج ہے۔ پھر کہتا ہوں کہ سُوت کو کیا کروں؟

کیا آپ میری حالت میں حمل کے روکنے کی دوائیاں استعمال کرنے کی اجازت دیں گے؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں شہوانی جذبے کو قابو میں رکھنے اور برہمچریہ میں بھی اعتقاد رکھتا ہوں۔ مگر میں اس بات سے بھی ڈرتا ہوں کہ اگر اپنے اوپر پورا قابو پانے سے پہلے میں نے حمل روکنے کی مصنوعی تدبیریں اختیار نہ کیں تو بچے اسقدر زیادہ ہو جائیں گے کہ میں تو تباہ ہو جاؤں گا۔ ایسی حالت میں اپنی بیوی کے جذبات کو بھی روک دینا مناسب نہیں۔ کیونکہ اُس کی صحت پر خراب اثر پڑے گا۔ ہر مرد اور عورت کی زندگی میں شہوانی جذبہ تو لازمی طور پر اپنا کام کرتا ہے ہی۔ میں یا میری بیوی کبھی مستثنٰے نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً میری بیوی جو پڑھی لکھی نہیں ہے۔ اُس تک آپ کے خیالات کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ خط کچھ لمبا ہو گیا ہے۔ اگر میں مختصر لکھتا تو آپ کو سب بات سمجھا نہ سکتا۔ آپ جس طرح سے مرضی ہے خط کو کام میں لائیے۔

جواب۔ جو مشکلات یہ طالب علم بیان کرتا ہے اگرچہ اہم ہیں مگر سب کی سب خود پیدا کردہ ہیں۔ اُس کے بیان سے صاف

میں پڑھتا ہوں۔ میری عمر ۲۱ برس کی ہو گی۔ مجھے علم سے بڑی محبت ہے اور میں بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر آپ کے خیالوں کا بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ میں ایک مہینہ بعد ایم۔اے کا امتحان پاس کر لوں گا اور مجھے کوئی کام کرنا ہو گا۔

میری ایک بیوی ہے اور چار بھائی ہیں۔ وہ سب مجھ سے چھوٹے ہیں۔ اور ان میں سے ایک شادی شدہ ہے۔ میری دو بہنیں ہیں جو بارہ برس سے کم عمر کی ہیں۔ اور میرے والدین بھی زندہ ہیں۔ ہمارے پاس کوئی سرمایہ بھی نہیں اور نہ ہی کوئی جائداد ہے۔ والدین کی خدمت لازمی ہے۔ اب میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کی تعلیم کا کیا بندوبست کروں؟ پھر بہنوں کی شادی کرنی ٹھہری۔ خوراک اور کپڑا وغیرہ کہاں سے آئے؟ مجھے اس بات کا بھی شوق ہے۔ کہ ہم اچھی طرح سے رہیں۔ صحت کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر طرح کی ضروریات مہیا ہونی چاہئیں۔ پھر کچھ پاس بھی ہونا چاہیئے۔ کیا معلوم کس وقت ضرورت پڑ جائے؟ اتنے بڑے کنبے کو پالنا ہے۔ کم از کم دو وقت کا کھانا اور صاف کپڑے تو سب کے لئے ہوں۔

میں تو کفایت شعاری کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں اور دیانتدار بھی رہنا چاہتا ہوں۔ میں نہ تو سود کی کمائی کھانا چاہتا ہوں نہ ہی حرام کاری کی۔ مجھے ملک کی خدمت کرنے کا بھی خیال ہے جو شرائط آپ اُس مضمون میں لگاتے ہیں وہ بھی میں پوری کر سکتا ہوں۔ مگر

طالب علموں کیلئے

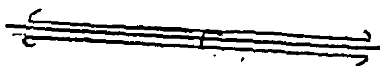
"ہریجن" - ۱۷ اپریل ۱۹۳۷ء

ایک طالب علم لکھتا ہے "ایک طالب علم کی مشکل" والے مضمون کے متعلق میں نہایت عاجزی سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں آپ براہِ مہربانی غور فرمائیے۔

طالب علم کے سوال کا جواب آپ نے انصاف سے نہیں دیا۔ اس کی مشکل کا کوئی حل ہی نہیں ہے۔ آپ کا جواب کچھ ایسا ویسا ہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ طلبا کو یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ وہ پڑھے لکھے ہیں اور اس لئے مزدوری سے انکو عار ہے۔ اور مزدوری کرنے سے انکی کسرِ نشان ہے۔ بھلا ایسی باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔ اور آپ تو ماشاء اللہ بڑے عالم شخص ہیں۔ ذرا تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالیئے اور ایک مفصل اور مکمل جواب دیجیئے جو عمل میں لایا جا سکے۔ ذیل میں مثلاً میرا ہی ذاتی معاملہ درج ہے اسپر غور فرمائیے۔

میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے (قدیم ہندوستان کی تاریخ)

تو اُسے مہارت ہو جاتی ہے اور وہ ہاتھ سے کام لینا اور اوزار وغیرہ کا استعمال کرنا جلدی سیکھ لیتا ہے اور ساتھ ہی عقل بھی تیز ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح سے طلبا کی بیکاری کا سوال بھی حل ہو جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مزدور خیال کریں۔ مرضی کے برخلاف شادی ہونے کے متعلق جو لکھا ہے اُس میں میرا کہنا صرف یہی ہے کہ طالب علموں کو ایسے موقعہ پر بڑی ہمت سے کام لینا چاہیئے اور خلاف مرضی کوئی کام نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ ہر جائز طریق سے اُنہیں مقابلہ پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ تاکہ کوئی کام اُنکی رضامندی کے بغیر نہ ہو سکے۔ شادی تو خلاف مرضی کبھی نہ ہونی چاہیئے۔



انٹرنس پاس کیا ہوا ہے تو وہ مزدوری کرکے بھی روٹی کما سکتا ہے۔ پڑھا لکھا ہونے کے سبب وہ ہر طرح سے ہوشیار ہوگا۔ اور ہاتھ پاؤں مار کر وہ مزدور سے اچھا نکلیگا۔ کیونکہ معمولی مزدور میں آخر کتنی سمجھ ہوسکتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مزدور نے چونکہ انگریزی نہیں پڑھی اسلئے بے سمجھ ہوگا۔ مگر اتنی بات تو ضرور ہے کہ جو طالب علم سکول میں پڑھ چکے ہیں مزدور کے مقابلہ پر انہیں اچھا موقعہ مل جاتا ہے اور وہ ہر طرح سے ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ ہاں دیگر ممالک کے طلبا کے مقابلے میں تو وہ کچھ نہیں ہوتے۔ کیونکہ اتنا تھوڑا سا پڑھنے لکھنے کے بعد بھی تو وہ اپنے آپ کو بہت کچھ خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور یہ سکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دیجاتی ہے اسکا نقص ہے۔ طلبا کو خیال ہو جاتا ہے کہ وہ صرف میز کرسی پر بیٹھ کر ہی کام کر سکتے ہیں۔ سوال کنندہ کیلئے لازمی ہے کہ اس خیال کو چھوڑ دے اور ہاتھ سے کام کرکے اپنے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالے۔ بیوی بھی خالی وقت میں کچھ کام کرے اور آمدنی میں اضافہ کرے۔ بلکہ اگر بچے بھی کام کر سکتے ہوں تو وہ بھی کچھ کما دیں۔ خیال بالکل غلط ہے کہ کتابیں پڑھ لینے سے ہی عقل تیز ہوتی ہے ہاتھ کا کام اگر باقاعدہ طریقے سے کیا جائے تو اس سے بھی سمجھ بڑھتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی پیشے میں شاگردی کرتا ہے

۳۹

ایک طالب علم کی مشکل

("ہری جن"- ۹ر جنوری ۱۹۳۷ء)

ایک طالب علم سوال کرتا ہے :-

سوال - ایک طالب علم جس نے امتحان انٹرنس یا ایف-اے پاس کیا ہو اور اُس کے گھر بدقسمتی سے دو تین بچے بھی ہوں- وہ کس طرح سے روٹی کمائے اور گذارہ کرے- اگر شادی بھی اُسکی مرضی کے برخلاف کر دی گئی ہو اور اُس کی عمر بھی شادی کے وقت پچیس سال سے کم ہو تو وہ کیا کرے؟

جواب - اسکا سادہ جواب میری سمجھ میں تو یہ ہے کہ ایک طالبعلم جو اپنے بیوی بچوں کو سنبھال نہیں سکتا- یا جس کی شادی اُسکی رضامندی کے بغیر ہوئی ہے وہ پڑھا لکھا کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے- ہاں مگر جو ہو چکا وہ تو واپس نہیں آسکتا- بچارے طالبعلم کو ایسا جواب دینا چاہیئے جو اُس کے کام آسکے- مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے- اگر اُسے اس بات کا خیال نہ ہو کہ اُس نے

سکھلانا چاہتے ہوں۔ اور ہوں بھی ہوشیار۔ تو ضرور اُن کی محنت بارآور ہوگی۔ اور گجرات کے نوجوان بچے اس دلدل میں گرنے سے بچ جائیں گے۔ اور وہ جو گر چکے ہیں وہ بھی باہر نکل آئیں گے۔



انسان دماغ سے نہ صرف سوچ سکتا ہے بلکہ وہ دُکھ اور سُکھ کو بھی محسوس کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ عقل سے کام نہ لے تو بمنزلہ حیوان ہی سمجھنا چاہیئے۔ انسان کی عقل اُس کے جذبات کو قابو میں رکھتی ہے۔ مگر حیوان میں عقل کم ہوتی ہے اور وہ بُرے اور اچھے میں تمیز نہیں کر سکتا۔

شہوانی جذبے کو قابو میں کرنا وہی آدمی سکھلا سکتا ہے کہ جس نے خود اس جذبے کو قابو میں کیا ہو۔ مثلاً ستاروں کا علم وہی شخص سکھلا سکیگا جو خود اُس علم کو جانتا ہوگا۔ اسی طرح سے اس جذبے کے متعلق سکھلانے والے بھی وہی ہو سکتے ہیں جنکو خود اپنے اوپر قابو ہے۔ بڑی بڑی تقریریں بے سود ثابت ہوں گی۔ اس میں تو ذاتی تجربے کی ضرورت ہے۔ ورنہ کچھ فائدہ نہیں۔ تقریر بھی وہی کامیاب ہو سکتی ہے جس کی پُشت پر صحیح تجربہ اور انبھو ہو۔

فی زمانہ ہمارا تمام ماحول۔ ہمارے خیالات اور ہمارا مطالعہ اور ہماری سماج کا رجحان اس شہوانی جذبے کو اُبھارنے کی طرف ہے اس کے پنجے سے چُھٹکارا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی ہمیں کوشش کرنی چاہیئے۔ چاہے ایسے اُستادوں کی تعداد جو اس کا تجربہ رکھتے ہوں کم ہی کیوں نہ ہو۔ بشرطیکہ وہ اس جذبے پر قابو پانا اپنا فرضِ منصبی خیال کرتے ہوں۔ اور دوسروں کو بھی اس پر قابو پانا

سب مذہبوں میں شہوت پرستی کو بُرا خیال کیا گیا ہے۔ اِس سے اُتر کر غضب اور نفرت کا جذبہ ہے۔ گیتا کی تعلیم کے مطابق غضب اور نفرت شہوت پرستی سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ گیتا میں تو شہوت یا کام دیو کو خواہشات نفسانی کے معنوں میں استعمال کیا ہے مگر مراد ایک ہی معلوم ہوتی ہے۔

ابھی تک اِس سوال کا جواب نہیں ملا کہ آیا چھوٹی عمر کے بچوں کو اس جذبے کے متعلق کچھ تعلیم دی جائے یا نہیں۔ میری رائے میں کچھ نہ کچھ ضرور بتلا دینا چاہیئے۔ اب تو وہ اس کے متعلق اِدھر اُدھر سے کچھ سیکھ لیتے ہیں اور غلط کاریوں میں پڑ جاتے ہیں اگر اس جذبہ کی پرواہ نہ کی جائے تو اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں تو اس بات کے حق میں ہوں کہ جوان لڑکے اور لڑکیوں کو اس کے متعلق سب بات سمجھا دینی چاہیئے۔ میں تو اس ذمہ واری اور فرض کو جہاں تک مجھ سے ہو سکا اپنی اولاد کے حق میں ادا کرتا رہا ہوں۔

مگر اس جذبے کے متعلق جو بھی تعلیم دی جاوے وہ ایسی ہونی چاہیئے کہ نوجوان اُس پر غلبہ پا سکیں اور اُسے روک کر اپنی طاقت کو دوسری طرف لگا سکیں۔ اُنہیں پھر معلوم ہو جائیگا۔ کہ انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے اور وہ یہ بھی جان جائینگے کہ انسان کو ایک دل اور دماغ عطا ہوا ہے جو قابل قدر ہے۔

اِس پر غالب آئے بغیر نفسِ امارہ پر کوئی شخص قابو نہیں پا سکتا۔ اور جب تک نفسِ امارہ کو مارا نہ جائے سوراج یا رام راج کیسے مِل سکتا ہے؟ جو شخص اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتا وہ بھلا دوسروں پر کہاں حکومت کر سکتا ہے۔ اُسے سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ مٹی کا بنا ہُوا آم دیکھنے میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کون ایسے آم کو کھا سکتا ہے؟ الغرض جس نے شہوانی جذبے پر قابو نہیں پایا وہ بھلا ہری جنوں کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کو کس طرح قائم کر سکتا ہے؟ اُس میں اتنی ہمت کہاں کہ کھدّر۔ گاؤ رکھشا اور دیہات سُدھار میں کوئی مدد دے سکے۔ ایسے کاموں میں صرف دماغی لیاقت کیا کام دے سکتی ہے۔ روحانی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ طاقت سوائے ایشور کی مہربانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور اُسکا فضل ایسے شخصوں پر کیونکر ہو سکتا ہے جو شہوت پرستی کے غلام ہوں؟

سوال یہ ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم میں شہوانی جذبہ کے متعلق کس طرح تعلیم دی جائے اور یہ تعلیم ہو یا نہ ہو شہوانی جذبہ کے متعلق دو طرح سے تعلیم دیجا سکتی ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس جذبہ پر قابو پایا جائے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس جذبہ کو اُبھارا جائے۔ پہلا طریقہ اختیار کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ بالکل خطرناک ہے۔ اور اُسے اختیار نہیں کرنا چاہئے

شہوانی جذبے

("ہریجن" ۱۲؍نومبر ۱۹۳۶ء)

شہوانی جذبہ آج کل نہ صرف گجرات کے صوبے میں ہی بلکہ سارے ہندوستان میں روز افزوں ہے۔ اور اُس پر طُرفہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کے زیر اثر ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ کوئی بُرا کام نہیں۔ جب ایک غلام یہ سمجھنے لگے کہ زنجیریں اُس کا زیور ہیں تو سمجھو کہ مالک کے پو بارہ ہیں۔ مگر کام دیو کا اس طرح ہم پر غلبہ پا جانا اگرچہ شروع میں بھلا معلوم ہوتا ہے مگر جو خوشی اُس سے ہوتی ہے وہ محض عارضی ہے۔ اور اُس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اور آخر وہ حالت ہو جاتی ہے جو ایک بچھو کی ہوتی ہے جس میں ڈنک مارنے کی طاقت زائل ہو گئی ہو۔ مگر اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ اور دیکھتے رہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ چونکہ شہوانی جذبہ غالب ہے اِسلئے ہمیں چپکے نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ بلکہ دِ اور عورت کو چاہیئے کہ اس جذبہ پر غالب آئے۔ کیونکہ

چاہیئے کہ وہ یہ ایک قیمتی چیز ہے۔ وہ اپنی بیوی کو کام میں لگائے رکھیں اور اُن کی خوراک اور ورزش کا خیال رکھیں۔ تاکہ یہ جذبہ تیز نہ ہونے پائے۔ اگر نامہ نگار صاحب خود دھارمک خیالوں کے ہیں اور ایشور پر وشواس رکھتے ہیں تو بیوی کو بھی یہی سکھلائیں کیونکہ کوئی شخص پاک دامن نہیں بن سکتا جب تک اُس کا ایشور میں جو ایک حقیقت ہے۔ پُورا وشواس نہ ہو۔ آج کل یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ لوگ پاکیزہ زندگی کے حصول کیلئے ایشور پر وشواس رکھنا ضروری قرار نہیں دیتے۔ میرے خیال میں جنکا وشواس اُس قادرِ مطلق پر نہیں کم از کم میرے لئے اُنکو اس اصول کا سمجھانا مشکل ہے۔ میرا اپنا تجربہ تو مجھے یہی بتلاتا ہے کہ ایک زندہ طاقت ضرور ہے جس کے ذریعے یہ سب نظامِ عالم جاری ہے جس میں یہ وشواس نہیں وہ سمجھو ایسا ہے جیسے سمندر میں پانی کا ایک قطرہ۔ کہ جونہی سمندر سے علیحدہ ہُوا غائب ہو گیا۔ سچ پوچھو تو ہر قطرہ سمندر ہے اور وہی شان رکھتا ہے کہ جو سمندر۔



ہے۔ مگراب تو میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اصول اساسی ہے۔ اور اگر کوئی اس کی اہمیت کو سمجھے تو اس اصول پر عمل پیرا بھی ہو سکتا ہے۔ میرا مدعا تو تب ہی حاصل ہوگا جب لوگ اِس اصول پر عمل کرنے لگینگے۔ میرے لئے تو یہ ایک زندہ اصول ہے۔ اگر ہم اسکو توڑتے ہیں تو ہمیں اسکا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے۔ اگر نامہ نگار صاحب اس اصول کی صحیح معنوں میں قدر کرتے ہیں اور اُنہیں اپنی بیوی سے سچا پیار ہے اور اپنے اوپر بھی بھروسہ ہے تو اُنہیں بیوی کو اپنا ہمخیال بتانا چاہیئے۔ سوال تو یہ ہے کہ نامہ نگار صاحب سچ مچ اپنے آپکو روک سکتے ہیں یا نہیں۔ کیا اُنہوں نے اپنے نفس کو جیت لیا ہے؟ اور اُن میں یہ تبدیلی واقع ہوگئی ہے کہ وہ اپنی طاقت کو بنی نوع انسان کی خدمت میں صرف کرنے لگے ہیں؟ کیا وہ کوئی ایسی حرکت تو نہیں کرتے جس سے شہوانی جذبہ اُنکی بیوی کو جوش میں لے آئے؟ شائد اُنہیں معلوم نہیں ہندو شاستروں میں آٹھ قسم کی مباشرت ہے جن میں ایسی حرکات بھی شامل ہیں جو عورت کے جذبات کو انگیخت دیتی ہیں۔ کیا نامہ نگار صاحب اس سے مبرّا ہیں؟ اگر یہ بات نہیں ہے اور وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ اُنکی بیوی بھی شہوانی جذبے سے بچی رہے تو اُنپر لازم آتا ہے کہ بیوی کو پیار سے سمجھائیں کہ شادی کا اصل مطلب صرف سنتان پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور اُنہیں بیوی کو یہ بھی سمجھانا

ہوں۔ مگر میری بیوی نہیں روک سکتی۔ وہ بچے تو نہیں چاہتی مگر زندگی کا لطف اُٹھانا چاہتی ہے۔ پھر میں کیا کروں؟ کیا میرا فرض نہیں کہ میں اُس کی تسلی کروں۔ میں یہ تو نہیں کرسکتا کہ میری بیوی لطف اٹھانے کیلئے دیگر معیوب طریقے اختیار کرے۔ اکثر اخباروں میں دیکھتے ہیں کہ آپ شادی کرنیکے برخلاف نہیں بلکہ بہت سی شادیاں آپ نے کروائی ہیں اور انہیں آشیرباد دی ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ جو لوگ شادی کرتے ہیں اُن کا وہ آدرشں نہیں ہوتا جو آپ بیان فرماتے ہیں؟"

جواب۔ نامہ نگار صاحب درست فرماتے ہیں میں اکثر اُن شادیوں کو آشیرباد کہتا ہوں جہاں مجھے معلوم ہے کہ اور سب شرائط پوری ہوئی ہیں۔ مثلاً عمر اور کفائت شعاری وغیرہ ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اِس سے تو ظاہر ہے کہ میں اپنے ملک کے نوجوانوں کو خوب سمجھتا ہوں اور جہاں میری نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے میں رہنمائی کرتا ہوں۔

نامہ نگار جیسے اور بہتیرے شخص ہیں جو اس مشکل میں مبتلا ہیں۔ میری اُن کے ساتھ پوری ہمدردی ہے۔ شادی کا اصل مقصد اولاد پیدا کرنا ہے۔ یہ میرے لئے بھی ایک نئی بات ہے۔ میں اِس اصُول سے تو پہلے بھی واقف تھا۔ مگر میں اس کی اہمیت کو نہیں جانتا تھا۔ میں خیال کرتا تھا کہ اگر ایسا ہو تو بہت مبارک

۳۷

ایک نوجوان کی مشکل

("ہریجن" ۲۵ اپریل ۱۹۳۶ء)

ایک نامہ نگار جو اپنا نام نہیں بتلانا چاہتا ایک سوال کا جواب چاہتا ہے۔ جو اُس کے دل میں میرا مضمون بہ عنوان "نوجوانوں سے خطاب" ہریجن میں پڑھنے کے بعد پیدا ہُوا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی گُمنام خط وکتابت کا جواب دینا تو نہیں چاہیئے مگر چونکہ سوال بڑا اہم ہے اسلئے میں جواب دیئے دیتا ہوں۔

خط ہندی میں ہے اور ذرا معمول سے لمبا بھی ہے۔ خُلاصہ ذیل میں درج ہے :۔

"آپ کی تحریر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نوجوانوں کے جذبات کو بالکل نہیں سمجھتے۔ جو آپ کے لئے ممکن تھا وہ بھلا سب نوجوانوں کے لئے کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ مثلاً میں ایک شادی شدہ نوجوان ہوں۔ میں اپنے نفس کو روک سکتا

پیدا کرنے کیلئے عطا ہوا ہے۔ اس کا بُرا استعمال کرنا گویا ایشور اور انسانیت کے خلاف گناہ کرنا ہے۔ حمل کو روکنے کے طریقے پہلے بھی تھے اور موجودہ زمانے میں بھی ہیں۔ مگر پہلے وقتوں میں اُن کا استعمال بُرا سمجھا جاتا تھا۔ یہ اِس زمانے کا ہی حصّہ ہے کہ ایک برائی کو نیکی کی شکل دی جاتی ہے۔ سب سے بڑا نقصان جو اِن خیالات کے پرچار کرنے والے ہمارے نوجوانوں کو پہنچا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اُن کے آدرش (مقصد) کو پیروں تلے روندا جا رہا ہے۔ نوجوان مردوں اور عورتوں کو اِس جھوٹے دیوتا سے خبردار ہو جانا چاہیئے۔ اور وہ قیمتی عطیہ جو ایشور کی طرف سے اُن کو ملا ہے اُسے سنبھالنا چاہیئے۔ اور اُس کا صحیح استعمال کرنا چاہیئے یعنی جس مطلب کیلئے وہ عطیہ دیا گیا ہے صرف اُسی کیلئے استعمال کرنا چاہیئے۔



ہاں تو غریب طبقہ بہت کثرت سے ہے۔

ایسے خیالات کے پرچار کرنے سے ایک اور بڑا نقصان بھی ہے۔ ہمارے پراچین آدرشوں کی جگہ ایسے خیال ہونے سے ہماری قوم یا جاتی کا اخلاق بالکل بگڑ جائے گا۔ اور جسمانی صحت بھی خراب ہو جائے گی۔ ہمارے شاستروں میں منی یا ویریہ کے ضائع کرنے کے نقصانات کے متعلق بہت کچھ لکھا ہؤا ہے۔ اور ایسا کرنے سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ بھلا اُن کا کہنا فضول تو نہیں اور نہ ہی وہم ہے۔ اگر کوئی کسان بالفرض عمدہ بیج کو ریتلی یا پتھریلی زمین میں ڈالے تو ہم اُس کی اِس حرکت کو حماقت سے تعبیر کریں گے یا نہیں؟ اور اگر کھیت اچھی طرح سے تیار کیا جائے مگر بیج ایسے طریقے سے ڈالا جائے کہ نہ اُگے تو پھر بھی کیا حاصل؟ پرماتما نے مرد کو ویریہ دیا ہے جو بمنزلہ بیج ہے۔ اور عورت ایک زرخیز زمین کی طرح ہے جو نہایت ہی پوتر ہے۔ مرد کے لئے اپنے قیمتی ویریہ کو ضائع کرنا بڑے درجے کی حماقت ہے۔ وہ عورت بھی مجرمانہ حماقت کی مرتکب ہو گی اگر وہ بیج کو زمین میں ڈلوانے کی بجائے ضائع ہونے دے۔ اس طرح دونو مرد اور عورت قصوروار ٹھہرتے ہیں۔ اور اُن سے وہ قیمتی بخشش واپس لے لی جاوے گی شہوانی جذبہ ایک نہایت ہی عمدہ جذبہ ہے۔ اس میں شرم کرنے کی کوئی بات نہیں۔ مگر یہ جذبہ صرف اولاد

طرح پوتر رہ سکتی ہے اور اُس میں کس طرح کوئی اصلاح کی جا سکتی ہے؟ یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ ایسی کنواری لڑکیاں بھی موجود ہیں جو سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا رہی ہیں۔ اور اس قسم کی کتابیں اور میگزینیں پڑھتی رہتی ہیں جن میں حمل کے روکنے کے طریقے دیئے ہوئے ہیں۔ بلکہ یہاں تک سُنا گیا ہے کہ بعض لڑکیوں کے پاس وہ دوائیاں بھی موجود ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ صرف شادی شدہ عورتیں ہی ان دوائیوں کو استعمال نہیں کرتیں بلکہ کنواری لڑکیاں بھی۔ شادی کا تو اصل مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے جب مرد اور عورت شہوت پرستی میں لگے رہیں اور یہ خیال نہ کریں کہ ایسا کرنے سے زیادہ اولاد کا ہونا ضروری ہے۔

مجھے تو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جو لوگ ایسے خیالات کا پرچار کرتے ہیں اور لوگوں کو حمل روکنے کی تعلیم دیتے ہیں وہ ملک کے نوجوانوں کے دشمن ہیں اور اُن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اُنکے ایسا کرنے سے اُن غریب عورتوں کا بھلا ہو گا جن کو بچے جننے پڑتے ہیں۔ اور جو چاہتی ہیں کہ اولاد زیادہ نہ ہو۔ بلکہ جو خاندان بچے نہیں چاہتے اُن تک تو یہ دوائیاں پہنچتی ہی نہیں۔ ہماری بچاری غریب ہندوستانی عورتیں ان باتوں کو کیا جانتیں؟ وہ کوئی مغرب کی عورتوں کی طرح پڑھی لکھی تو ہیں نہیں۔ متوسط طبقے کی عورتیں شاید کچھ سمجھدار ہوں۔ مگر ہمارے

ہے جیسا کہ قرض لیا ہُوا روپیہ واپس کرنا۔ اور اگر کوئی ایسا نہ کرے
تو اُس کی دماغی طاقت زائل ہو جائے گی۔ نفسانی خواہشات کا
پُورا کرنا اور بات ہے۔ اور اولاد پیدا کرنا دوسری بات ہے۔ اسلئے
لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان جب دوا کے استعمال سے حمل کو روک
سکتا ہے تو کیوں نہ روکے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں جب
بچوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو بچے پیدا کر لئے ورنہ نہیں میری
رائے میں ایسے خیالات کا پرچار کرنا نہایت ہی خطرناک ہے۔ اور
خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں متوسط طبقے کے لوگ
بے اعتدالی کی وجہ سے پہلے ہی کمزور ہو چکے ہیں۔ اگر خواہشات
نفسانی کا پُورا کرنا فرض قرار دے دیا جائے تو دوسرے طریقوں سے
ویریہ (منی) کو گرانا بھی فرض ہو جاتا ہے۔ اور اس سے بڑی خرابی
پیدا ہو جاتی ہے۔ ناظرین کو معلوم رہے کہ بعض مشاہیر نے بھی
خواہشات نفسانی کو پورا کرنا فرض ہی قرار دیا ہے۔ فرض کرو کہ
نوجوانوں میں یہ بات ناپسندیدہ نہ ہو۔ تو یہ خرابی لڑکے اور لڑکیوں
میں اور بھی پھیل جائیگی۔ اور وہ اِس شہوانی جذبے کا شکار ہو جائیں
گے۔ میرے خیال میں تو حمل کو دوائی سے روکنے اور نفسانی
خواہشات کے پُورا کرنے سے جو نقصان ہوتے ہیں وہ ایک ہی
طرح کے ہیں۔ اس قسم کی دوائیوں کی ایجاد اور لوگوں کی پسندیدگی
نے تو سارا کام ہی بگاڑ دیا ہے۔ بھلا ہماری سماجک زندگی کس

۱۴۔

نوجوانوں سے خطاب

("ہریجن" ۔ ۲۸ مارچ ۱۹۳۶ء)

آجکل یہ عام رواج ہوگیا ہے کہ نوجوان اپنے بڑوں کا کہنا بالکل نہیں مانتے۔ میں یہ کہنے کیلئے تیار نہیں کہ نوجوان بالکل غلطی پر ہیں۔ مگر پھر بھی میں نوجوانوں سے کہے دیتا ہوں کہ یہ خیال کہ بڑے (مرد ہوں یا عورت) جو کچھ کہتے ہیں وہ سب نہ ماننے کے قابل ہے۔ درست نہیں۔ جس طرح بعض دفعہ بچے عقل کی بات کر بیٹھتے ہیں اسی طرح بڑے بھی عقل کی بات کہہ سکتے ہیں۔ اصلی قاعدہ تو یہ ہے کہ ہر بات کو عقل کے ترازو میں تولا جائے اور تجربہ کر کے دیکھا جائے۔ اس بات کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے کہ کہنے والا بچہ ہے یا بوڑھا۔

بعض لوگ اس لئے کہ بچے زیادہ نہ ہوں کئی قسم کی دوائیاں استعمال کرتے ہیں۔ میں اس کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اکثر کہا جاتا ہے۔ کہ نفسانی خواہشات کا پورا کرنا ایسا ہی ضروری

پڑتی کہ ایسی قبیح رسومات کی کچھ روک تھام کرسکیں؟ شادی تو ایسا معاملہ ہے جو اُن کے مستقبل کے ساتھ بالکل وابستہ ہے تعلیمیافتہ لڑکیاں بھلا اس بات سے گھبرا کر کہ اُنکی شادی اچھے گھرانے میں نہیں ہو سکتی کیوں خودکشی کر بیٹھتی ہیں؟ اگر اُن میں اتنی ہمّت بھی پیدا نہیں ہوتی کہ وہ ایسی بُری رسم کا زور سے مقابلہ کرسکیں تو اُن کی تعلیم کس مصرف کی ہوئی؟ اور رسم بھی ایسی جو عقل اور اخلاق کے بالکل برخلاف ہے! بات تو اصل میں یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم اس قدر ناقص ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو اس قابل ہی نہیں بناتا کہ وہ پرانے رواجوں کو توڑ سکیں۔ تعلیم تو وہی ٹھیک ہوا کرتی ہے جو طلبا میں اتنی لیاقت پیدا کر دے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ کی مشکلات کو اچھے طریقے سے حل کر سکیں۔



میں رہتے ہیں اور جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اُنکے رسم و رواج کی تو ہمیں بالکل کوئی خبر نہیں۔ یہ کہنے سے میری مراد یہ نہیں کہ جہیز یا لینی دینی کی رسم کو ہٹانا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ یہ رسم ایک محدود طبقے کے اندر جاری ہے۔ یہ رسم تو اُڑا دینی چاہیئے۔ اولاد کی شادی کو روپیہ کمانے کا ذریعہ بنا لینا بڑی حماقت ہے۔ اس رواج کا تعلق ذات پات کے ساتھ بھی ہے۔ جب تک شادی ذات کے اندر ہوتی ہے یہ رسم جاری رہے گی۔ چاہے ہم کتنی ہی کوشش کریں یہ دُور نہیں ہوگی۔ اگر یہ رسم دُور کرنی ہے تو ذات پات کے بندھن کو توڑ دینا چاہیئے۔ شادیاں بھی ذرا بڑی عمر میں کرنی ہونگی۔ اور اگر لڑکیوں کیلئے اچھے لڑکے نہ ملیں۔ تو بعض حالتوں میں لڑکیوں کو بغیر شادی کے گذارہ کرنا ہوگا۔ قوم کے نوجوانوں کے خیالات کو بدلنے کیلئے اس سلسلۂ تعلیم کو بھی بدلنا ہوگا۔ بدقسمتی سے موجودہ طریقۂ تعلیم کا ہمارے ماحول کے ساتھ کچھ تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ اور قوم کے لڑکے اور لڑکیوں کو (جن کی تعداد آبادی کے لحاظ سے بہت قلیل ہے) اس تعلیم سے چنداں فائدہ نہیں پہنچتا۔ بُری رسومات اور رواجوں کو ہٹانا تو لازمی امر ہے۔ مگر اس قسم کی بُرائیاں تب ہی دُور ہو سکتی ہیں جب حالات کے بدل جانے کیساتھ ساتھ ہی طریقۂ تعلیم بھی بدلے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ اتنے لڑکے اور لڑکیاں جو کالجوں میں سے پڑھ کر نکلتے ہیں۔ اُنہیں یہ ہمت نہیں

دینی لینی (یعنی جہیز) کی رسم

("ہریجن" - ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء)

کچھ مہینے ہوئے سٹیٹسمین[1] اخبار میں جہیز کے رواج پر جو بہت زمانوں میں اور تقریباً ہندوستان کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اور کچھ ایڈیٹوریل[2] بھی نکلے۔ میں بھی اکثر ینگ انڈیا" میں اس بُری رسم کے متعلق کبھی کبھی لکھتا رہتا تھا۔ سٹیٹسمین کے مضامین دیکھ کر مجھے کچھ دلفگار واقعات پھر یاد آ گئے۔ میں سندھ کی دینی لینی رسم کے متعلق کچھ لکھا کرتا تھا۔ بہت سے تعلیم یافتہ سندھی شادی کرتے وقت لڑکیوں کے ماں باپ سے بہت سا نقد روپیہ لیا کرتے تھے۔ اخبار سٹیٹسمین اس رسم کے برخلاف لکھا کرتا تھا۔ بلاشبہ یہ رسم بہت ہی بُری ہے۔ مگر رسم عام نہیں۔ متوسط طبقہ کے لوگ جن کی تعداد بہت زیادہ نہیں وہ اس رسم کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس طبقے میں بہت سی قبیح رسمیں جاری ہیں۔ جو لوگ گاؤں

---

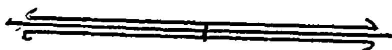
[1] Statesman [2] Editorial

لڑکیوں سے (جو اُس وقت حاضر تھیں) خطاب کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا:-

اے میری پیاری لڑکیو! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میری لڑکی ہوتی تو میں اُسکو کنواری رہنے دیتا مگر ایسے لڑکے کے ساتھ شادی نہ کرتا جو مجھ سے ایک پیسہ بھی لینے کی اُمید کرتا۔

پھر طلبا سے مخاطب ہوکر گاندھی جی نے ہنستے ہوئے کہا:-

اگر آپ لوگ میری تعریفوں کے پُل باندھتے رہیں گے اور میری نصیحت پر عمل نہ کروگے تو آپ شریف نہیں کہلا سکتے۔ آپ کو بھانڈ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔



محمدؐ کے سچے پیرو نہیں ہو۔ پیغمبر صاحب تو رُوکھی سُوکھی روٹی کھاتے اور معمولی کپڑے پہنا کرتے تھے۔ آپ بھی اُس خداترس خلیفے کی زندگی سے سبق سیکھئے۔

جب نرائن داس ملکانی نے آپ سے سندھ کے سیلاب زدہ علاقوں کی مدد کیلئے روپیہ مانگا تو آپ نے کچھ پرواہ نہ کی اور اُنہیں گجرات سے روپیہ مانگنا پڑا۔ یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ پھر آپکے ہاں دیتی لیتی یعنی جہیز کی قبیح رسم جاری ہے۔ بجائے اسکے کہ ہماری دیویاں گھر کی رانیاں ہوں اور اُن سے آپ کو پیار ہو وہ تو مویشیوں کی طرح خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ کیا انگریزی پڑھ لکھ کر آپ نے یہی سیکھا ہے؟ استری کو تو ہمارے ہاں اردھنگی کہا گیا ہے۔ مگر آپ نے تو اُسے لونڈی یا گولی بنا رکھا ہے۔ اِن باتوں نے تو ہمارے ملک کا ستیاناس کر دیا ہے۔

آخر میں گاندھی جی نے کہا:-

بُزدل لوگ کب سوراج کے لائق ہُوا کرتے ہیں اُس کیلئے تو قربانی کی ضرورت ہُوا کرتی ہے۔ اور یہ قربانی بھی خوشی سے دینی پڑتی ہے۔ یہ وعدہ کرو کہ دیتی لیتی کی رسم کو آپ ہٹا دیں گے اور اپنی بہنوں اور اِستریوں کو بالکل آزاد کرانے کی کوشش کریں گے۔ تب میں جانوں گا کہ آپ اپنے ملک کی آزادی کا دم بھرتے ہیں۔

آپ اپنے غریب بھائیوں کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا بھی چھین لیتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ہمارا ملک غریب ہوتا جا رہا ہے۔ کیا تجارت ہمیں خوشحال بناتی ہے؟ نہیں ہم تو تجارت کی وجہ سے لٹتے جا رہے ہیں۔ اور ہمارے تاجر تو صرف لنکا شائر اور مانچسٹر کے سوداگروں کے کمیشن ایجنٹ بنے ہوئے ہیں۔ اور انہیں ہر سو روپے پیچھے پانچ روپے کمیشن مل جاتا ہے۔ اور اس منافع سے ہمارے بڑے شہر جگمگا رہے ہیں۔ لارڈ سالسبری نے ایک موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ اگر ہندوستان کا خون چوسنا ہے تو جہاں آبادی زیادہ ہے وہاں سے خون نکالو۔ اور اگر اُن دنوں یہ بات تھی تو اب تو ہم بہت غریب ہو گئے ہیں۔ اب کیا حال ہو گا۔ تب سے تو بہت خون نکل گیا ہو گا۔ آپکو یہ بھولنا نہیں چاہیئے کہ غریبوں کا خون چوس کر آپکی تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ اور یہ بھی خیال کیجئے کہ یہ روپیہ جو آپ پر خرچ ہوتا ہے یہ شراب کے بکنے کی آمدنی سے آتا ہے۔ شراب پینا تو اور بھی تباہ کن ہے۔ جب یہ مالک کے حضور میں جا کر حساب دینا ہو گا تو وہاں پوچھا جائے گا۔ کہ آپ نے اپنے بھائیوں سے کیسا برتاؤ کیا تھا۔ تو آپ کیا جواب دیں گے؟

گاندھی جی نے پھر حضرت عمر کی مثال دی اور کہا کہ جب مسلمان بڑے عیش پرست ہو گئے اور عمدہ عمدہ کپڑے پہننے لگے تو خلیفہ صاحب نے کہا کہ تم میرے سامنے سے چلے جاؤ کیونکہ تم حضرت

در پیش تھا۔ اور یہ واقعہ جنگ بوئر کے بعد کا ہے۔ چنانچہ جرنیل صاحب اپنی زبان[1] میں بات چیت کرتے رہے اور ایک شخص ترجمہ کرتا گیا۔ آزادی پسند قوموں کے نمائندے ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

طلبا کی ٹیپ ٹاپ اور فضول خرچی کے متعلق گاندھی جی نے فرمایا:۔

اقتصادیات[2] کے مطالعہ کرنے سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ سرکاری خزانے سے جو آپ کی تعلیم پر خرچ ہوتا ہے۔ اُس کا عشرِ عشیر بھی فیسوں سے وصول نہیں ہوتا۔ بھلا اے میرے نفیس نوجوان دوستو! آپ نے کبھی یہ بھی خیال کیا ہے کہ یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ یہ روپیہ غریبوں کی جیب سے نکلتا ہے۔ ذرا اڑیسہ کے غریبوں پر نظر ڈالو۔ سوکھے پنجر ہیں۔ آنکھوں میں روشنی نہیں اور چہروں پر نا اُمیدی چھا رہی ہے۔ اور پیٹ بالکل خالی پڑا ہوا ہے۔ مٹھی بھر چاول وہ بھی ہلکے درجے کے اور چٹکی بھر نمک پر گذارا ہوتا ہے۔ اور یہ حال سال بھر سے ایسا ہی چلا جاتا ہے۔ کبھی کچھ امیر مارواڑیوں یا گجراتیوں نے دے دیا تو وہ لے لیا۔ آپ نے اپنے ہموطنوں کیلئے کیا کیا ہے؟ اپنی بہنوں کے پوتر ہاتھوں کا بنا ہوا کھدر پہننے کی بجائے آپ بدیشی کپڑا پہنتے ہیں۔ اور اس طرح سے ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ وطن کے باہر چلا جاتا ہے اور

---

1. Dutch 2. Economics

اور ہمالہ پربت تک اونچا کر دکھائیں اور جو کچھ میں کہوں خود اُس پر
عمل نہ کریں؟ خیر جو ہُوا سو ہُوا۔ اب جو آپ نے مجھے بلایا ہے اُس
کی تلافی کے لئے اپنی بدکرداریوں کا حساب دیجئے۔ (گاندھی جی
نے اُن سے حساب تو مانگا مگر بڑی سختی سے۔ اور سختی اس لئے نہیں
کی کہ اُنکو آزردہ خاطر کریں۔ بلکہ سختی کا مطلب ڈاکٹر کی طرح نشتر چلانا
تھا۔ تاکہ زخم اچھا ہو جائے۔ پہلے تو اُنہوں نے یہ بات پوچھی کہ ایڈریس
غیر زبان یعنی انگریزی میں کیوں پیش کیا گیا ہے۔ اُسے ہندی میں
یا اور نہیں تو سندھی میں لکھنا چاہیئے تھا۔ اگر اتنا لحاظ کرتے تو
اُنکی قدردانی کا حق ادا ہو جاتا۔ غیر ملکیوں کے لوگ بھی جب گاندھی
جی کی ملاقات کے لئے آتے ہیں تو وہ بھی لحاظاً اُن کے سامنے
جہاں تک ممکن ہوتا ہے ہندوستانی کے الفاظ استعمال
کرتے ہیں کیونکہ وہ اُنہیں خوش کرنا چاہتے ہیں۔ طلبا پھر کیوں
مادری زبان میں ایڈریس پیش نہ کریں؟ نہرو کمیٹی کی ایک سفارش
یہ بھی تھی کہ جب ہندوستان کو سوراج ملے تو راج کی زبان اور
عوام کی زبان ہندوستانی ہونی چاہیئے۔ (مؤلف)

گاندھی جی ہنسکر کہنے لگے کہ شائد تم کہتے ہو گے کہ ہم مکمل
آزادی کے حامی ہیں۔ میں آپ کے سامنے جرنیل بوتھا کی مثال
پیش کرتا ہوں۔ اُنہوں نے بادشاہ کے سامنے انگریزی بولنے سے
انکار کیا۔ اُس وقت جنوبی افریقہ کے ساتھ ایک معاہدے کا سوال

۳۴

سندھ کے طلبا

(”ینگ انڈیا“ ۱۴ر فروری ۱۹۲۹ء)

کراچی کے مختلف کالجوں کے طلبا کی طرف سے (جس میں لا کالج۔ انجینئرنگ کالج اور آرٹس کالج کے طلبا شامل تھے) جو ایڈریس ڈی۔ جے سندھ کالج کے ہال میں دیا گیا اُس کے جواب میں گاندھی جی نے کہا:۔

اے نوجوانو! انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نقل اُتارنا گویا ایک طرح سے صحیح معنوں میں خوشامد کرنا ہے۔ آپ نے اپنے ایڈریس میں تو میری تعریف کے پُل باندھ رکھے ہیں مگر آپ اپنی عملی زندگی میں میرے کہنے کے بالکل برخلاف کرتے ہیں۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ آپ کہیں کہ ہمیں معلوم تو ہے کہ آپ کیا چاہتے ہیں مگر ہم جان بوجھ کر آپ کے کہنے کے برخلاف کریں گے۔ شائد ایسا کرنے سے آپ کا ارادہ میری ہتک کرنے کا تو نہ ہو مگر کیا آپ کا ایسا خیال تو نہ تھا کہ مجھے تو بہانا بنا دیں

شادی کو روپیہ کمانے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں اور اس بری
عادت نے اُن کی قومی خدمات کو بھی پیچھے ڈال دیا ہے۔ ورنہ وہ اپنی
لیاقت اور علمیت سے ملک کو بہت فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ شادی
کے قابل لڑکیوں کے غریب والدین سے یہ اہل نوجوان بہت سا
روپیہ لے لیتے ہیں۔ اور چونکہ رواج ہو گیا ہے کوئی انگلی تک بھی
نہیں اُٹھا سکتا۔ سکولوں اور کالجوں میں اور لڑکیوں کے والدینوں
میں اس قبیح رسم کے متعلق چرچا کرنا چاہیئے۔ والدین کو چاہیئے
کہ وہ اپنی لڑکی کا رشتہ اُس نوجوان سے نہ کریں جو روپیہ مانگتا
ہو۔ بلکہ بغیر شائنی کے گذارہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔
اصلی با عزت شادی وہ ہوتی ہے جس میں فریقین کی آپس میں
محبت اور رضامندی ہو۔



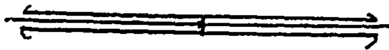
۴۳

سندھ میں ایک خرابی

(ینگ انڈیا - ۲۷ر دسمبر ۱۹۲۸ء)

سندھ کے آمل اُس صوبے میں سب سے آگے بڑھے ہوئے لوگ ہیں - باوجود اس کے اُن کے اندر بڑی خرابیاں ہیں - جہیز کی رسم تو نہائیت ہی خراب ہے - جب میں پہلی دفعہ سندھ میں گیا تو لوگوں نے میری توجہ اُس طرف دلائی اور مجھے آمل دوستوں سے اس کے متعلق کچھ کہنا پڑا - کہیں کہیں تو اس رسم کو دُور کرنے کی کوشش بھی ہوئی ہے - مگر رسم کا خاتمہ کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ کوشش نہیں ہوئی - آمل ایک چھوٹی سی مگر بڑی مضبوط برادری ہے - سب کو معلوم بھی ہے کہ یہ رسم بڑی خراب ہے - کوئی آمل اس کے حق میں نہیں ہے مگر آمل برادری میں جو تعلیمیافتہ نوجوان ہیں وہ اس منحوس رسم کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں - اُنکا خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے - اس لئے وہ سب دھرم ایمان چھوڑ چھاڑ کر

وظیفہ ہے بالکل نہیں کرتے کبھی کبھی ایسے ادارے مفید بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مگر طلبا کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ملک اگر اُن کی قدر کرتا ہے تو اُن کو کافی اجر مل گیا۔ لیکن اگر طلبا کی اندرونی حالت ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے تو اُن کی قومی خدمات سوائے اُس کے کہ اُنکو مغرور اور خود پسند بنا دیں اور کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔ مثلاً جہیز کی بہت بُری رسم کے برخلاف مضبوط آواز اُٹھانا ضروری ہے۔ جو نوجوان ایسے روپے کو لے اُسے سماج سے خارج کر دینا چاہیئے۔ لڑکیوں کے والدین ولائتی ڈگریاں دیکھ کر لالچ میں آکر اپنی برادریوں کے باہر اور دوسرے صوبوں کے دِل چلے نوجوانوں کے ساتھ رشتہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔



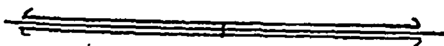
۲۷

طلبا کیلئے شرم کی بات

("ینگ انڈیا" ۲۱ جون ۱۹۲۸ء)

ایک نامہ نگار نے ایک اخبار سے اقتباس بھیجا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر آباد (سندھ) میں دولھا کی قیمت بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ تار کے محکمہ میں ایک انجنیر ہیں جنہوں نے سگائی ہونے کے وقت بیس ہزار روپیہ نقد لے کر پھر شادی کے موقعہ پر مزید رقم لینے کا وعدہ لیا ہے۔ اور اسکے بعد بھی سلسلہ جاری رہے گا۔ ایک نوجوان جو شادی کرنیکے وقت جہیز وغیرہ لینا منظور کرتا ہے صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتا۔ اور اپنے ملک کی عزت کو بٹہ لگاتا ہے۔ اور استری جاتی کی بے قدری اور بے حرمتی کا مرتکب ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سی نوجوانوں کی تحریکیں ہیں۔ اُن کو چاہیئے کہ ایسے سوالوں کو حل کریں۔ یہ ادارے بس اپنی تعریفوں کے پل باندھتے رہتے ہیں۔ اور اصلاح کا کام جو اُن کا اصلی

کی موجودگی کے اگر ہم ذمہ وار نہیں تو اور کون ہے؟
پُرانے زمانے میں طلبا برہمچاری کہلاتے تھے یعنی جو پرماتما کی راہ پر یا اُس سے ڈر کر چلا کرتے تھے۔ اُن کی راجے اور بزرگ لوگ بھی عزت کیا کرتے تھے۔ قوم اُن کا خرچ اپنے سر پر خوشی سے لیا کرتی تھی۔ اور اس کے عوض میں سینکڑوں مضبوط آتما والے عالی دماغ اور بہادر پڑھے لکھے قوم کو مل جایا کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں بھی طلبا گری ہوئی قوموں کے اندر اُس قوم کی اُمید شمار کئے جاتے ہیں اور وہ بڑا ایثار اور قربانی دکھلاتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی بلاشبہ ایسے طالبعلم ضرور ہیں مگر اُنکی تعداد بہت کم ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ طلبا کی کانفرنسوں کو اس قسم کا کام ہاتھ میں لینا چاہیئے اُسے نظم دینا چاہیئے۔ یہ ہے دراصل برہمچاریوں کا منصب۔



اور ہم ہندوستانی بہت غریب ہیں۔ اگر کچھ لوگ پڑھ لکھ بھی گئے۔ تو کیا بھلا اُن سے قوم بن جائے گی۔ اور ایسے طلبا جو قومیت کے نام پر قربان ہو جائیں وہ کہاں ہیں؟ طلبا کو چاہیئے کہ کم خرچ کرنے میں نمونہ بنکر دکھلائیں۔ اور قوم کی خوبیاں اپنے اندر لیں۔ اور سماج میں جو خرابیاں ہیں اُن کو دُور کرنے کی کوشش کریں۔

کانفرنسوں کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ طلبا پر واقعات کی حقیقت کھل جائے۔ اور جو باتیں اُنہیں سکولوں کے اندر جہاں اغیار کا اثر ہے معلوم نہیں ہو پاتیں وہ ایسے موقعوں پر معلوم ہو جائیں۔ خالص سیاسی سوالات کو بے شک حل نہ کریں۔ مگر سوشل اور اقتصادی سوالات کا مطالعہ کرنا اور اُن پر غور کرنا بھی تو ویسا ہی لازمی معلوم ہوتا ہے۔ آخر ایسے سوالات بھی فی زمانہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ قومی ساخت کے پروگرام کو تو ہر پہلو سے دیکھنا پڑتا ہے۔ طلبا کی زندگی لاکھوں اور کروڑوں ہموطنوں کی زندگیوں پر اثر ڈالے گی۔ آخر ہمارے ملک میں اور لوگ بھی تو بستے ہیں۔ طلبا کو تو بلا لحاظ صوبے یا شہر یا کسی جماعت یا ذات کے سارے ملک (جو ایک برّ اعظم کی طرح ہے) کی خدمت کرنی ہے۔ ہم میں اچھوت۔ شرابی۔ بدمعاش اور بیسوا عورتیں بھی تو شامل ہیں۔ اور ایسے لوگوں

مضامین پڑھے جائیں گے۔ مگر اُس گشتی چٹھی میں دیتی لینی یعنی جہیز کی رسم کے متعلق ذکر تک نہیں۔ یہ ایک ایسی بُری رسم ہے کہ اس نے سندھ کی لڑکیوں کی زندگی وبال میں ڈال رکھی ہے اور طلبا ہی اس رسم میں مبتلا ہیں۔ لڑکیوں کے والدین بھی بچارے دُکھی ہیں۔ طلبا کے اخلاق کے متعلق جو کچھ کانفرنس کرنا چاہتی ہے اُس کا چٹھی میں ذکر تک نہیں طلبا کس طرح سے نڈر ہو کر قومی خدمت کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی تجویز بھی کوئی پیش نہ ہوگی۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ سندھی پروفیسر کالجوں میں کام کر رہے ہیں مگر جو زیادہ کام کرتے ہیں اُن سے اور زیادہ کی اُمید ہوا کرتی ہے گجرات ودیا پیٹھ میں بڑے سندھی کام کر رہے ہیں۔ اور میں اُن دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر صرف پروفیسروں اور کھدّر کا کام کرنیوالوں سے ہی بھلا سب کام تھوڑا چل جایا کرتا ہے۔ سندھ میں سادھو وسوانی صاحب بھی ہیں اور بھی کئی لوگ ہیں۔ جو صوبے کی اصلاح میں مشغول ہیں۔ مگر جو بھی یہ لوگ کام کرتے ہیں اس پر بھلا طلباء کیا ناز کر سکتے ہیں؟ اُنہیں تو خود قومی خدمت کرنی چاہیئے اگر وہ صرف مغرب کی نقل اُتارتے رہیں گے اور اچھی انگریزی بولنا اور لکھنا سیکھ جائیں گے تو اس سے ملک کا آزادی کا مندر تو نہیں بن جائے گا۔ اول تو موجودہ تعلیم پر خرچ بہت ہوتا ہے

لے Sadhu Vaswani

گشتی چٹھی سے اقتباس

کانفرنس کے منتظمین یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کانفرنس کو کامیاب اور مفید بنایا جائے۔ ہم کچھ تعلیمی تقریریں بھی کروانا چاہتے ہیں اور آپ سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں مستفید فرمائیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کا سوال سندھ کے صوبے میں خاص توجہ کے قابل ہے۔ ہماری اور بھی بہت سی ضروریات ہیں جن کو ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ کانفرنس کے موقعہ پر کھیلوں کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے۔ اور کچھ مباحثے بھی ہوں گے۔ الغرض کانفرنس ہر طرح سے دلچسپ بنائی جائے گی۔ پروگرام میں گانا بجانا اور ڈرامہ یعنی ناٹک بھی رکھا گیا ہے۔ ناٹک اُردو اور انگریزی دونو زبانوں میں دکھلایا جائے گا۔

جواب۔ مفصلہ بالا گشتی خط میں سے کام کی باتیں سب درج کر دی گئی ہیں۔ اُن سے پتہ چل جاتا ہے کہ کانفرنس کیا کچھ کرے گی مگر پروگرام میں ایک بھی ایسی بات معلوم نہیں ہوتی جو طلبا کے ہمیشگی کے فائدے کی ہو۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ گانا بجانا۔ ناٹک اور کھیل تماشہ خوب شاندار ہوگا۔ گشتی چٹھی ہی خود اس کی گواہ ہے اور لفظ "شاندار" اُس میں سے ہی لیا گیا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کانفرنس میں تعلیم نسواں پر اچھے اچھے

۳۱

طلبا کی کانفرنس

("ینگ انڈیا" ۹ر جون ۱۹۲۷ء)

سندھ کے طلبا کی چھٹی کانفرنس کے سیکرٹری نے مجھے ایک چھپی ہوئی گشتی[ے] چٹھی بھیجی۔ جس میں لکھا کہ ہمیں کوئی پیغام دو۔ بعد میں مجھے ایک تار بھی آیا۔ میں کہیں ایسے دُور دراز مقام پر تھا۔ کہ وہاں مجھے چٹھی اور تار دونو بڑی دیر سے ملے اور میں وقت پر جواب نہ دے سکا۔ میرے پاس بہت سے اس قسم کے خطوط آیا کرتے ہیں۔ بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں مضامین بھی بھیجو۔ مجھے طلبا جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں بڑی دلچسپی ہے۔ کیونکہ میں ہندوستان کے طلبا کو خوب جانتا ہوں۔ جو پروگرام اُس گشتی چٹھی میں تھا اُس پر میں دل ہی دل میں سوچتا رہا۔ میں اپنے خیالات کو قلمبند کرتا ہوں تاکہ طلبا کو اُس سے فائدہ پہنچے۔ وہ گشتی چٹھی بڑی خراب چھپی ہوئی تھی اور اُس میں بے حد غلطیاں تھیں۔ جو کہ معافی کے لائق نہیں

ے Circular letter

کر دیئے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ وقت اب فرضی سے رہ گئے ہیں اور لوگ زیادہ تر دکھاوے کیلئے دُعا یا پرارتھنا کرتے ہیں۔ پرارتھنا کے لئے لازمی ہے کہ انسان کا دل اُس کی طرف متوجہ ہو۔ ہاں ایسی پرارتھنا جس میں ایشور سے کچھ مانگتا ہے وہ ضرور اپنی زبان میں ہونی چاہیئے۔ بھلا اس سے بہتر اور کیا پرارتھنا ہو سکتی ہے جسمیں ہم ایشور سے یہ مانگتے ہیں کہ وہ ہمیں انصاف عنایت کرے۔ انصاف کو ہم سب جاندار چیزوں کیساتھ بھی برتیں۔



نہیں بنائے جا سکتے۔ یہ بات افراد کے مزاج پر چھوڑ دینی چاہیئے۔
ہماری روزانہ زندگی میں جو وقت پرارتھنا میں گذرے وہ قیمتی
وقت خیال کرنا چاہیئے۔ مطلب تو یہ ہے کہ ہم بڑے عجز اور انکسار
سے اس بات کا احساس کریں کہ پرماتما کی مرضی کے بغیر کوئی
کام نہیں ہو سکتا۔ اور ہم تو ایسے ہیں جیسے کمہار کے ہاتھ میں
مٹی۔ بعض وقت جب انسان اپنی گذری ہوئی زندگی پہ نظر
دوڑاتا ہے تو اُسے پُر از گناہ پاتا ہے۔ پچھتاتا ہے اور سر بسجود
ہو کر معافی مانگتا ہے۔ اور یہ پرارتھنا کرتا ہے کہ اے ایشور!
مجھے پہلے سے بہتر بنا۔ اس کیلئے تو ایک منٹ بھی کافی ہے اور
چوبیس گھنٹے بھی کم ہیں۔ اور جنکو قرب حاصل ہے وہ تو ہر کام
میں سمجھو پرستش میں مشغول ہیں۔ اُن کی زندگی ایک مسلسل دُعا
یا پرارتھنا ہے۔ اور بعض تو نفس پرستی میں اس قدر غلطاں پیچاں
ہیں کہ انہیں اُس سے ہی فرصت نہیں۔ وہ اگر دن بھر دعا کرتے
رہیں تو بھی کم ہے۔ بلکہ اُن کے لئے تو یہ لازم آتا ہے کہ جب
تک اُن کے گناہ بالکل دُھل نہ جائیں تب تک پرارتھنا جاری
رہے۔ ہم جیسے معمولی انسانوں کے لئے درمیان کا طریقہ مناسب
معلوم ہوتا ہے۔ نہ تو ہم اپنا سب کچھ پرماتما کو ارپن (سونپ)
کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہم نفس پرستی میں مشغول رہ سکتے ہیں۔
اسی لئے سب دھرموں نے خاص وقت پرارتھنا کے لئے مقرر

سے کچھ مانگنا ہے۔ لفظ پرارتھنا بعض وقت پرستش کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مراسلہ نگار کی مراد پرستش سے ہے۔ معنی کو چھوڑیئے۔ بھلا لاکھوں ہندو مسلمان۔ عیسائی اور یہودی جو ہر روز وقت مقررہ پر پرماتما کے حضور دعا یا پرارتھنا کرتے ہیں اُس سے کیا مراد ہے۔ میرے خیال میں تو یہ پرماتما کا قرب یا نزدیکی حاصل کرنے کیلئے سب کچھ کیا جاتا ہے۔ یا اِس لئے کہ اُس کی برکتیں ہم پر نازل ہوں۔ ایسی حالت میں الفاظ کچھ ہی ہوں۔ پرارتھنا آتما کے پرماتما کیساتھ تعلق پیدا کرنیکا نام ہے۔ بعض حالتوں میں وہ الفاظ جو قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں ایک خاص اثر لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اگر انہیں مادری زبان میں ترجمہ کر دیا جائے تو وہ اثر جاتا رہتا ہے۔ مثلاً گایتری منتر اگر گجراتی زبان میں پڑھا جاوے تو وہ اثر نہیں رکھے گا جیسا سنسکرت میں۔ لاکھوں ہندوؤں کے دل پر لفظ رام جادو کا اثر رکھتا ہے۔ مگر گاڈ (ایسے ہی) یا خدا کا لفظ وہ اثر نہیں رکھتا معنی تو وہی ہیں۔ لفظوں میں بھی جب وہ مدتوں سے مستعمل ہوں اور متبرک ہوں ایک خاص اثر ہوا کرتا ہے۔ اگر سنسکرت کے شلوک اور منتر ویسے کے ویسے ہی پڑھے جاویں تو اُن میں بھی ایک اثر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اُن کے معنی سمجھ میں آنے چاہئیں۔

پرارتھنا کے وقت مقرر کرنے کے متعلق کوئی خاص قواعد

۳۰

پرارتھنا کسے کہتے ہیں؟

("ینگ انڈیا" ۱۰ جون ۱۹۲۶ء)

ایک ڈاکٹری پاس کیا ہوا طالب علم پوچھتا ہے:-

"سب سے اچھا طریقہ پرارتھنا کا کیا ہے؟ پرارتھنا پر کتنا وقت خرچ کرنا چاہئے؟ میری رائے میں تو انصاف کرنا سب سے اچھی پرارتھنا ہے۔ اور جو شخص سچے دل سے سب کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرتا ہے اُسے پرارتھنا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بعض لوگ دیر تک سندھیا کرتے رہتے ہیں۔ اور ۹۵ فیصدی نہیں جانتے کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ میری رائے میں پرارتھنا مادری زبان میں ہونی چاہئے۔ ایسی پرارتھنا کا دل پر اثر ہو سکتا ہے۔ اگر سچے دل سے ایک منٹ بھی پرارتھنا کی جائے تو کافی ہے۔ بلکہ اگر انسان صرف اتنا کہہ دے۔ کہ اے ایشور! میں آئندہ گناہ نہیں کروں گا تو کافی ہے۔

جواب۔ پرارتھنا کے معنی پرماتما سے بڑے عجز اور انکساری

اگر آپ جو کچھ میں نے کہا ہے سمجھ گئے ہوں تو آپ بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کہیئے گا کہ وہ آپ کیلئے پیار رکھنا کا انتظام کریں اور اُسے جبری قرار دیں۔ اپنے نفس پر جبر کرنا جبر نہیں کہلاتا۔ جو شخص اس قسم کے جبر سے آزاد ہونا چاہتا ہے گویا نفس پرست ہونا چاہتا ہے۔ اصلی معنوں میں آزاد وہ ہے جو قانون اور قاعدے کے مطابق زندگی گذارتا ہے۔ اس عالم میں کُل کائنات مثلاً سورج۔ چاند اور ستارے وغیرہ ایک نظام کے تحت کام کرتے ہیں۔ اگر یہ قوانینِ قدرت کام نہ کرتے ہوتے تو نظام کس طرح قائم رہ سکتا تھا۔ آپ لوگ جنکا کام دوسروں کی سیوا یا خدمت کرنا ہے بھلا بلا قاعدے اور قانون کس طرح کچھ کر سکتے ہیں۔ اور پیار رکھنا بھی ایک قسم کا روحانی قانون ٹھہرا۔ انسان اور حیوان میں فرق کیا ہے۔ بس یہی کہ انسان کسی قاعدے کے مطابق زندگی گذارتا ہے۔ اگر ہم انسان بننا چاہتے ہیں اور حیوان نہیں کہلانا چاہتے تو ہمارے لئے پابندیِ قانون لازمی ہے۔



اپنا روز کا کام شروع کر دیگا وہ خود بھی دُکھی ہو جائے گا اور دوسرے کے دُکھ کا سبب بن جائے گا۔ جو شخص پرارتھنا کرتا ہے اُسے پرلوک میں ہی نہیں بلکہ اِس لوک میں بھی سُکھ ملتا ہے۔ اگر ہم اپنے روز کے کام میں سُکھ اور شانتی چاہتے ہیں تو ہمیں ضرور پرارتھنا کرنی چاہیئے۔ ہم جو آشرم میں رہتے ہیں اور سچ کی تلاش کر رہے ہیں اور اس پر اتنا زور دیتے ہیں ہمیں پرارتھنا میں پورا پورا وشواس تو تھا مگر ہم نے کبھی اُسے بہت اہمیت نہ دی تھی۔ ایک دن جب میں صبح سویرے ہی جاگا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم نے اس پہلو میں بڑی سُستی دکھلائی ہے۔ میں نے فوراً ہی باقاعدہ پرارتھنا کرنے کا نیم (دستور) جاری کر دیا۔ اور ہمیں بہت فائدہ ہوا ہے۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ لازمی فرض کو ادا کرنا ضرور چاہیئے۔ اور باقی سب کچھ بعد میں خود بخود ہو جائے گا۔ مربع میں ایک زاویہ درست ہو تو باقی تین خود بخود صحیح نکل آئینگے۔

صبح اُٹھتے ہی پہلے پرارتھنا کرو۔ اور وہ پرارتھنا ایسی اچھی کہ شام تک کام دے۔ شام ہوتے ہی پھر پرارتھنا کرو۔ تاکہ آپ کی رات اچھی گذرے۔ نہ کوئی خواب آئے اور نہ کوئی ڈر ہی باقی رہے۔ پرارتھنا کے طریق کا کوئی خیال مت کرو۔ کسی طرح ہو، مراد تو ایشور سے واسطہ پیدا کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ الفاظ منہ سے نکلتے جائیں اور آپ کا دل کہیں اور گھوم رہا ہو۔

ہونا مشکل خیال کرتے ہیں۔ بھلا ہر وقت کہاں اُس ایشور کا دھیان کر سکتے ہیں۔ اسی لئے تو پرارتھنا کے لئے وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ تاکہ اُس وقت تو کم از کم دنیا کے خیال کو چھوڑ کر ذرا اندر کی طرف دیکھے۔ پرارتھنا ایک قسم کی تڑپ ہے جو ہماری آتما کو پرماتما کیلئے بیچین کئے دیتی ہے۔ آپ نے بھگت سُورداس جی کا بھجن تو سنا ہی ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"میرے جیسا قابلِ نفرت اور شیطان اور کون ہوگا
میں ایسا نمک حرام ہوں کہ میں نے اپنے خالق کو بھلا دیا ہے"

ہمارے خیال میں سُورداس جی بڑے بھگت تھے۔ مگر وہ اپنے آپکو بڑا عاصی اور گنہگار خیال کرتے تھے۔ روحانیت میں وہ ہم سے کہیں بڑھ کر تھے۔ مگر وہ ایشور سے اپنے آپ کو اتنا دور سمجھتے تھے کہ اُنہوں نے نراش ہوکر مذکورہ بالا دوہرا اُچارن کیا (فرمایا)۔

پرارتھنا کی ضرورت کو بتلاتے ہوئے میں نے پرارتھنا کے مُدّعا کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ ہمیں تو اپنے بھائیوں کی خدمت کرنی ہے۔ اور وہ کس طرح ہو سکتی ہے جب تک ہم ہوشیاری سے کام نہ لیں۔ ہمارے اندر تو اچھے اور بُرے جذبات کی جنگ ہوتی رہتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص پرارتھنا کا سہارا نہ لے تو وہ جذبات کے بہاؤ میں بہہ جائے گا۔ جو پرارتھنا کا آسرا لے گا البتہ وہ بچ نکلیگا۔ اور اُسے آرام ملیگا۔ اور جو کوئی پرارتھنا کئے بغیر

ہیں ماحصل ایک ہی ہے۔ جب انسان کچھ مانگے بھی تو یہی کہے کہ
اے ایشور! میرے آتما کو پوتر یا پاک کر اور میرے اندھکار او
جہالت کے پردوں کو پھاڑ۔ جو شخص بھی اس پوتر جوتی (پاک روشنی
کو اپنے اندر جگانا چاہتا ہے اُسے پرارتھنا کرنی چاہیئے۔ مگر پرارتھنا
صرف منہ سے بول دینے یا کانوں سے سُن لینے کا ہی نام نہیں
ہے۔ یا منتروں کو دُہرانے سے ہی پرارتھنا نہیں ہو جاتی۔ رام نام
جپنے سے تو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ آتما کے اندر سے یہ آواز نکلنی چاہیئے
پرارتھنا کا تعلق تو دل سے ہے نہ کہ زبان سے۔ اگر دل حاضر نہ
ہو تو لفظ کچھ معنے نہیں رکھتے۔ مراد یہ ہے کہ پرارتھنا آتما سے اُٹھنی
چاہیئے۔ جس طرح اگر کسی کو خوب بھوک لگی ہو تو وہ کھانا مزے
سے کھاتا ہے۔ اسی طرح سے جسکی آتما بھوکی ہو اُسے پرارتھنا کا
آنند مل سکتا ہے۔ اب میں آپ کو اپنے تجربے اور چند ایک
دوستوں کے تجربے کی بات بتاتا ہوں۔ پرارتھنا میں وہ جادو
بھرا ہے کہ آپ کئی دن تک بغیر کھانے کے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مگر
بغیر پرارتھنا کے ایک لمحہ بھر بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ پرارتھنا
کے بغیر دل شانت نہیں ہوتا۔

شاید کوئی کہے کہ اگر یہی بات ہے تو ہمیں ہر لحظہ پرارتھنا
کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں کیا شک ہے۔ مگر ہمارے جیسے
بھولنے والے انسان ایک لمحہ کے لئے بھی تو انتر دھیان (محو

شخص کہے کہ میں سانس تو لیتا ہوں مگر مجھے ناک کی ضرورت نہیں۔ ہر انسان کسی نہ کسی طرح عقل کی وجہ سے یا اسے وہم سمجھو یا اندر کی آواز سمجھو یہ بات جانتا ہے کہ کوئی خالق ضرور ہے۔ جو لوگ ایشور کی ہستی سے منکر بھی ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے۔ وہ بھی کسی نہ کسی اخلاقی اصول کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اُن اصولوں پر چلنے سے سُکھ ملیگا۔ اور نہ چلنے سے دُکھ ہوگا۔ بریڈلا[1] صاحب جو مشہور ناستک تھے وہ بھی اپنے اندر کے عقیدے کو کھُلم کھُلا بیان کیا کرتے تھے۔ سچ سچ کہہ دینے کی وجہ سے لوگ اُنہیں ستایا بھی کرتے تھے۔ مگر وہ خوش ہوا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مجھے سچ کہنے کا اجر ملگیا ہے۔ اور واقعہ میں اُنکو خوشی ہوا کرتی۔ مگر یہ دنیاوی خوشی نہ تھی یہ اُس غیبی طاقت سے ملاقات کی خوشی تھی۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جو اپنے آپکو لامذہب بھی کہتے ہیں اُنکا بھی کوئی نہ کوئی مذہب ہوتا ہے۔

اب میں پرارتھنا کے مضمون کیطرف آتا ہوں یعنی انسان کے لئے پرارتھنا کیوں ضروری ہے؟ اوّل تو یہ کہ پرارتھنا دھرم کا ایک ضروری انگ یا حصہ ہے۔ پرارتھنا کے معنی یا تو کچھ مانگنا یا وسیع معنوں میں انتر دھیان (محو) ہونا ہے۔ دونو حالتوں

[1] Bradlaugh

۲۹

پرارتھنا پر بات چیت

("ینگ انڈیا" ۲۳ جنوری ۱۹۳۰ء)

ذیل میں پرارتھنا کے متعلق جو گفتگو چھتر سمیلن کانفرنس کے موقعہ پر گاندھی جی نے کی درج کی جاتی ہے۔ یہ کانفرنس گجرات کے ایک بورڈنگ ہاؤس کے لڑکوں نے منعقد کی تھی۔

گفتگو

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ سب چاہتے ہیں کہ میں آپ کو پرارتھنا کی ضرورت اور اس کے مدعا کے متعلق کچھ کہوں۔ میرے خیال میں تو پرارتھنا دھرم کی روح و رواں ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کے لئے اس کی بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ کوئی شخص دھرم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنی عقل کے زعم میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کا مذہب یا دھرم کے ساتھ کچھ واسطہ نہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کوئی

چھوڑ دینا ہے۔ وہاں تو گھاس پھوس ہی اُگے گا۔ اور کھیت کو کسان ہی ٹھیک کر سکتا ہے کہ جو کھیتی کا کام جانتا ہے۔

نامہ نگار صاحب نے جو پچھلے زمانوں میں آگ کی ایجاد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اُس کا اِس مضمون کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اُس زمانے کی ایجادیں بلاشبہ نہایت ہی قابل قدر ہیں۔ اُن میں کافی عقل خرچ کی گئی تھی۔ مگر پرارتھنا اور تپسیا اُس زمانے میں بھی زندگی کا ایک جزو اعظم تھا۔ جس کام میں ان کو ملحوظ نہ رکھا جائے وہ کام ایسا ہی ہے جیسا ایک خوبصورت پھول بغیر خوشبو کے ہو۔ بے شک عقل سے کام لینا چاہئے۔ مگر جو عقل سے بھی بالاتر ہے یعنی آتما اُس کا بھی خیال کرنا چاہئے۔



طالب علم کے سوال کے جواب میں مَیں نے مضمون لکھا تھا وہ تو اُن کروڑوں میں سے ایک ہے اور اُس جیسے منتاشیوں کی تسکین کیلئے ہی وہ مضمون لکھا گیا تھا۔ نامہ نگار صاحب جو عقل کو معیار کلیہ سمجھے بیٹھے ہیں اُنہیں میں اپنے مقام سے ہلانا نہیں چاہتا۔

نامہ نگار صاحب تو بزرگوں اور اُستادوں کو نوجوانوں کی زندگی کو کسی سانچے میں ڈھالنے ہی نہیں دیتے۔ جوانی میں بچوں کو جدھر چاہو موڑ توڑ لو۔ موجودہ طریقۂ تعلیم بھی تو اُنہیں ایک سانچے میں ڈھال رہا ہے۔ نامہ نگار صاحب اس بات کو تو مانتے ہیں کہ جسم اور دماغ کی تربیت ضرور ہونی چاہیئے۔ ہاں روح یا آتما جو انسانی جسم اور دماغ کو چلاتا ہے اُس کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیئے شاید نامہ نگار صاحب اُس کی ہستی سے ہی مُنکر ہیں۔ مگر آتما کی ہستی سے انکار کرنے سے کیا حاصل ہے یہ تو کوئی دلیل نہ ٹھہری۔ کیونکہ ایک وشواسی کہہ سکتا ہے کہ جب آپ کو بچوں کے جسم اور دماغ کو تربیت کرنے کا حق حاصل ہے تو مجھے بھی اُن کی آتما کو نشوونما دینے کا حق حاصل ہے۔ نامہ نگار صاحب خود اپنی دلیل کو کس طرح کاٹ سکتے ہیں۔ جب دھرم کی تعلیم کے صحیح معنی سمجھ میں آجاویں گے تو دھارمک تعلیم کی سب خرابیاں دُور ہو جائینگی اس تعلیم کا نہ دینا ویسا ہی ہے جیسے ایک کھیت کو ہل چلائے بغیر

کرکے دیکھنی چاہیئے۔ ذرا دوسروں کی شہادت کو ملاحظہ کیجئے پادری ہیومین[1] صاحب نے بھی کبھی عقل کو جواب نہیں دیا۔ مگر پرارتھنا کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ہمیشہ یہ گیت گایا کرتے تھے "میرے لئے پہلا قدم اُٹھانا کافی ہے"! شنکراچاریہ کا فلسفہ کس قدر مدلل ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب دلیل کے لحاظ سے اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر وہ بھی پرارتھنا اور شردھا یا ایمان پر بڑا زور دیتے تھے۔

نامہ نگار صاحب نے واقعات زمانہ سے نتیجہ نکالنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ ہر ایک چیز کا غلط استعمال ہو سکتا ہے عالم انسانی میں تو یہی اصول کام کر رہا ہے۔ مذہب کے نام پر بلاشبہ پچھلے زمانوں میں بڑے اتیاچار اور ظلم ہوئے ہیں۔ مگر اس میں مذہب یا دھرم کا کیا قصور! حضرت انسان میں حیوانیت کا اثر باقی ہے۔ کیونکہ اصل میں انسان بھی تو ایک حیوان ہی ہے۔

ابھی تک میرے مشاہدے میں تو کوئی شخص ایسا نہیں آیا جس نے عقل کو تو معیار قرار دیا ہو اور ہر کام کو عقل سے کیا ہو اور شردھا یا ایمان کو ایک طرف رکھ دیا ہو۔ مگر کروڑوں ایسے شخص ہیں جنہوں نے ایشور پر وشواس کر رکھا ہے اور با قاعدہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ شردھا ہی ایک قسم کی پرارتھنا ہے جس

---

[1] Cardinal Newman

کہ ہم پر جبر ہو رہا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں اسمیں ہماری بڑی بےعزتی اور ہتک ہوئی ہے۔ اور ہم لڑکے ہوں یا بڑے فوراً بھڑک اُٹھتے ہیں بہت سی سماجک بندشیں نہایت ہی فائدہ مند ہوتی ہیں مگر ہم اُنہیں نہیں مانتے۔ اور اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً جب حکومت سبگنے کا حکم دیتی ہے تو ایسا کرنا بالکل نامردی اور بزدلی میں شامل ہے۔ اسی طرح سے اپنے جذبات کا شکار بن جانا اور اُن کی غلامی کرنا اور بھی زیادہ شرمناک ہے۔

نامہ نگار صاحب ایک دوسرے لفظ کے چکر میں پھنس رہے ہیں اور وہ لفظ "معیارِ عقل" ہے۔ ہے تو بڑا اہم۔ ایک وقت تھا کہ میں بھی اسی لفظ کے چکر میں تھا۔ تجربے سے مجھے تو معلوم ہو گیا کہ اس معیار کی مخصوص حدود نہیں عقل کا صحیح استعمال نہ کرنا بےعقلی کے برابر ہے۔ اور مٹی اگر اِدھر اُدھر کر دیجائے تو کوڑا کرکٹ بن جاتی ہے۔ "جو قیصر کا حق ہے وہ قیصر کو دے دو" والے اصول پر عمل کرنا اچھا ہوتا ہے۔

جو لوگ عقل کو معیار قرار دیتے ہیں وہ قابلِ تحسین ہیں۔ مگر جب عقل کو معیارِ کلیہ قرار دیا جاتا ہے تو سب کام بگڑ جاتا ہے۔ ایسا کرنا تو اُسی قسم کی بُت پرستی ہوئی جیسے پتھر کی مورت کو ایشور مان لینا۔

دلیل سے کسطرح کوئی برا رتھنا کے فوائد کو سمجھ سکتا ہے؟ برا رتھنا تو

دماغی یا تعلیمی ترقی میں سدِ راہ ہوئے ہیں۔

جواب۔ اگر ایک بیس سالہ طالب علم لڑکا یا چھوکرا نہیں کہلا سکتا تو مجھے نہیں معلوم کہ ہم لڑکا کسے کہتے ہیں؟ میں تو سکول جانیوالے سب لڑکے اور لڑکیوں کو چاہے وہ کس عمر کے بھی ہوں بچے ہی خیال کرتا ہوں۔ اچھا لڑکا کہو یا آدمی میری دلائل تو ویسی کی ویسی ہی قائم رہتی ہیں۔ طالب علم تو ایک فوج کے سپاہی کی طرح ہے۔ سپاہی چالیس برس کا بھی ہو سکتا ہے، جو ایک دفعہ فوج میں بھرتی ہو گیا تو اُسے قاعدہ اور قانون ماننا ہی ہوتا ہے۔ اُس میں چون و چرا نہیں ہو سکتی۔ ہاں جب فوج کو چھوڑ دے تو پھر جو مرضی ہے کرے۔ مگر جب تک سپاہی ہے حکم ماننا اُس کیلئے ضروری ہے۔ ویسے ہی طالب علم چاہے وہ کیسا ہی لائق کیوں نہ ہو جب سکول یا کالج میں داخل ہو گیا تب بغیر حکم ماننے کے اُسے کوئی چارہ ہی نہیں اس میں طالبعلم کی لیاقت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ بلکہ ایسا کرنے سے تو اس کی لیاقت اور بھی بڑھے گی۔ مگر حضرت نامہ نگار صاحب تو الفاظ کی اُلجھن میں پھنس رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک کام کرنا پسند نہیں کرتا اور اُسے کہا جائے کہ تم کرو تو بھلا اس میں جبر کہاں وا۔ جب ہم اپنے اوپر جبر کرتے ہیں تو وہ تو نفس کُشی کہلاتی ہے۔ اور یہ ہمیں پسندیدہ ہوتی ہے۔ مگر جب کوئی دوسرا شخص ہمیں ہماری مرضی کے خلاف کچھ کرنے کے لئے کہتا ہے تو ہم خیال کرنے لگتے ہیں

سے مرحبا یا کرتے تھے۔ اور ابھی حضرت انسان نے آگ سُلگانا بھی نہ سیکھا تھا۔ آپ جیسیوں نے ہی آگ کے موجد کو طنزاً یوں کہا ہوگا۔ جناب آپ کی ایجادوں سے کیا حاصل؟ بلکہ ایشور کی طاقت اور قہر کے مقابلے پر آپ کیا کر سکتے ہیں؟ خدا کی بادشاہت میں تو وہ لوگ داخل ہونگے جو مسکین ہیں۔ آگے کی تو کون جانے مگر یہاں تو بیچارے غریبوں کا بُرا حال ہے۔ آدم یہ سر مطلب اپنا یہ کہنا کہ پہلے مان لو اور نتیجہ یا ایمان آ ہی جائیگا۔ اسکا کیا مطلب ہے۔ ایسی تعلیم نے ہی تو ہمیں تعصب سکھلایا ہے۔ بس بچوں کو پکڑ لیا اور اُن سے جو جی چاہا کہلوا لیا۔ اسی طریقے سے تو لوگ کٹر ہندو یا کٹر مسلمان بن جایا کرتے ہیں۔ ہر طبقے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو ایسے تعصبات سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ وہ تو مجبوراً متعصب بنے ہوئے تھے۔ کیا آپ اس بات کو نہیں تسلیم کرتے کہ بچے اگر ذرا بڑے ہو کر اپنی مذہبی مقدس کتابوں کو پڑھیں تو وہ متعصب نہیں رہینگے۔ اور خواہ مخواہ کی فضول باتوں پر لڑ نہیں مریں گے۔ ہندو مسلم فسادوں کا ایک ہی علاج ہے کہ مذہبی تعلیم بالکل ہی بند دی جائے۔ مگر آپ کب اِسکو قبول کریں گے؟

اگرچہ آپ نے ہندوستانیوں کیلئے جو بڑے ڈرپوک تھے بہادری قربانی اور عملی زندگی میں ایک بےمثل مثال قائم کر دی ہے۔ مگر جب آپکے متعلق آخری فیصلہ دیا جائے گا تو یہ کہنا پڑیگا کہ آپ ملک کی

اور ایشور پر شردھا رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو منکر بھی نہیں مگر انکو مذہب یا دھرم سے کوئی مس نہیں چونکہ سب لوگوں کو پرارتھنا سے مدد ملنی ضروری معلوم نہیں ہوتی اور چونکہ لوگ آزاد بھی ہیں اور انکو پرارتھنا کرنے سے کوئی روکتا بھی نہیں اور لوگ جب چاہتے ہیں پرارتھنا کر بھی لیتے ہیں تو پھر اس میں جبر کے کیا معنی؟ اور اس سے کیا فائدہ؟ ورزش یا تعلیم اگر جبری ہو تو عجب نہیں۔ کیونکہ اُن سے تو انسانی جسم اور دماغ پھولتا پھلتا ہے۔ مگر ایشور میں شردھا یا پرارتھنا کرنا کیا خاص تبدیلی پیدا کر سکتا ہے؟ دنیا میں بہت سے ایشور کو نہ ماننے والے بڑے اچھے آدمی ہو چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے آپ کہینگے کہ پرارتھنا اور بھی مفید ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اُنہیں عاجزی اور انکساری سکھلائے گی یہ آپکی پہلی دلیل ہے۔ بھلا یہ عجز اور انکساری کس مصرف کی ہے؟ علم کی بھی کوئی حد ہے۔ بڑے بڑے سائنسدان بھی ان صفات سے متصف ہوتے رہے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ محقق بھی ہوئے ہیں۔ اور جہاں اُنہوں نے قدرت کے سربمہر راز کھولے ہیں وہاں اپنی علمی لیاقت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج ہم ہاتھوں سے زمین کرید کرتے بلکہ ہمارا تو نام ونشان دنیا میں باقی نہ رہتا۔

اس زمانے میں جب سردی بہت پڑا کرتی تھی اور لوگ بنری

لکھنا ہے اور آپ وشواس یا ایمان پر زور دیتے ہیں۔ یہ عقل اور ایمان کی جنگ ایک قدیم جنگ ہے اور یہ اختلاف بھی قدیم ہے۔ طرفین میں سے ایک کا تو یہ کہنا ہے کہ مجھے دلیل سے سمجھا دو میں ایمان لے آؤنگا۔ دوسرا کہتا ہے کہ پہلے ایمان لے آؤ پھر بات خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔ ایک تو عقل کو معیار ٹھہراتا ہے اور دوسرا صرف مان لینے کو ہی میزان قرار دیتا ہے۔ آپکا خیال ہے کہ نوجوان اکثر منکر ہوا کرتے ہیں مگر کچھ مدت کے بعد ایمان لے آتے ہیں۔ سوامی وویکانند کی مثال آپکے اس خیال کی ممد ہے۔ اسی لئے تو آپ اُس لڑکے کیلئے باقاعدہ پرارتھنا کرنیکی دوا تجویز کرتے ہیں۔ آپ پرارتھنا کے متعلق دو دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پرارتھنا اسلئے کیجاتی ہے کہ ہم کمزور اور دُربل ہیں۔ اور ہمارا فرضی ایشور قوی اور قدیر ہے۔ دوسرے پرارتھنا کرنیسے یہ فائدہ ہوگا کہ ہمیں بڑی تسکین ہوگی اور تسکین کی انسان کو بڑی ضرورت ہے۔ پہلے میں آپکی دوسری دلیل کا جواب دیتا ہوں اس دلیل سے تو یہ مراد ہوئی۔ کہ انسان ایک سہارا چاہتا ہے۔ دنیا میں اسقدر مصائب اور تکالیف پیش آتی ہیں کہ انسان کی عقل کام نہیں دیتی۔ اُسوقت وہ نتیجہ یا وشواس کی ٹیک لیکر پرارتھنا یا دعا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بیشک ہر ایک کو حق حاصل ہے کہ وہ پرارتھنا کا سہارا لے اُسے اختیار ہے۔ مگر کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونگے (اگرچہ اُنکی تعداد بہت کم ہے) جو عقل کو میزان ٹھہراتے ہیں اور اُنہیں پرارتھنا کرنے

۲۸

الفاظ کی اُلجھن

("ینگ انڈیا- ۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۶ء")

ایک نامہ نگار میرے "پرارتھنا پر وشواس نہ ہونا" والے مضمون کے متعلق یوں لکھتے ہیں :-

آپ کے اُوپر لکھے ہوئے عنوان والے مضمون نہ تو اُس طالب علم یا لڑکے کا ہی پُورا پُورا جواب دیتے ہیں بلکہ آپ جیسے عالم کی شان کے بھی شایاں نہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اُس طالب علم نے بھی جو درخواست کی تھی اُس کے الفاظ مناسب اور معقول نہ تھے۔ مگر اُس کے خیالات کے صحیح ہونے میں تو کوئی شُبہ نہیں ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اُن معنوں میں ایک چھوکرا نہیں کہا جا سکتا جن معنوں میں آپ خیال کرتے ہیں۔ شائد اِس طالب علم کی عُمر بیس برس سے کم نہ ہوگی۔ اگر وہ کچھ کم عُمر کا بھی ہو تو بھی اُسے کافی لیاقت معلوم ہوتی ہے۔ اور اُسے یہ کہنا کہ لڑکے کو ایسی بحث میں نہیں پڑنا چاہیئے درست معلوم نہیں ہوتا۔ وہ لڑکا تو مدلّل خط

تاکہ گھڑی اچھی طرح سے کام کرے۔

اکٹھے مل کر پرارتھنا کرنا بھی بڑی طاقت رکھتی ہے۔ جو انسان اکیلا تن تنہا نہیں کر سکتا وہی کام مِلکر بہت بہتر کر سکتا ہے۔ بچوں کو عقیدے سے کیا جھگڑا۔ وہ اگر پرارتھنا میں حاضر ہو جائیں اور اُنکا دل نہ بھی چاہتا ہو تو بھی اُنکو آنند یا خوشی ہوگی۔ بچے شرارت بھی کرتے ہیں۔ مگر پرارتھنا اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ ایسے طالب علم بھی ہوتے ہیں جو شروع میں تو ایسی باتوں پر ہنسی اُڑاتے ہیں۔ مگر بعد میں مِلکر پرارتھنا کرنے میں اُنکا پکّا وِشواس ہو جاتا ہے۔ ایسا اکثر دیکھا گیا ہے۔ جن کا نشچیہ (اعتقاد) کمزور ہوتا ہے وہ بعد میں پکّے وِشواسی بن گئے ہیں۔ مثلاً جو لوگ گرجوں، مسجدوں اور مندروں میں جاتے ہیں کیا سب کے سب پاکھنڈی ہوتے ہیں؟ اُن میں سے اکثر (مرد اور عورتیں) پاک دامن بھی ہوتے ہیں۔ وہ تو اکٹھے مِلکر پرارتھنا کرنے کو ایسا ہی فرض سمجھتے ہیں جیسے روز نہانا۔ یہ معبد کوئی وہم پرستی تو نہیں کہ اُنہیں ایک دم ملیا میٹ کر دیا جائے۔ اب تک تو کوئی اُنہیں مٹا نہیں سکا اور نہ ہی آئندہ اُن کے مٹ جانے کی کوئی اُمّید ہے۔



نہ مانے لیکن اگر ایک طالب علم اپنے اُستادوں کی عزت کرتا ہے تو اُنکا کہنا بھی مانے گا۔ اسلئے نہیں کہ اُسے کوئی ڈر ہے یا بے سوچے سمجھے ہی۔ بلکہ یہ سمجھ کر کہ اُسے کہنا تو ضرور مان ہی لینا چاہیئے۔ کیونکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ جو بات آج سمجھ میں نہ آئی ہو وہ کل آ جائے۔

جب ہم پرارتھنا کرتے ہیں تو ہم کچھ مانگتے نہیں۔ صرف آتما کی پیاس کو بجھاتے ہیں۔ اپنی کمزوری کا ہر روز اقرار کرتے ہیں۔ ہم میں سے بڑے سے بڑا بھی موت۔ بیماری۔ بڑھاپے اور حادثے کے مقابلہ پر اپنی بے بسی کا اعتراف کرتا ہے۔ موت تو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ہمارے اپنے کارنامے کس مصرف کے ہوئے جبکہ چشم زدن میں اُنکا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ کس وقت موت کا پیغام آ پہنچے؟ موت کا وقت مقرر نہیں۔ لیکن اگر ہم راستی سے یہ کہیں کہ ہم تو سب کام پرماتما کے لئے اور اُس کی مرضی کے مطابق کرتے ہیں تو ہم ایک مضبوط چٹان کی طرح ہو جاتے ہیں جسکو کوئی طاقت ہلا نہیں سکتی۔ پھر تو سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے اور موت کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ تب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت کا وجود ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر غور کیا جائے تو موت دراصل ایک قسم کی تبدیلی ہے۔ ایک صاحب فن ایک تصویر کو بناتا ہے اور پھر مٹاتا ہے تاکہ اُسے پہلے سے بہتر بنائے۔ اسی طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پُرانے پُرزے کو پھینک دیتا ہے اور ایک نئے اور مفید پُرزے کو ڈال دیتا ہے

تو پھر وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یعنی جو جی چاہے سو کرے۔ پھر تو اُسے قاعدوں اور قانون کی پابندی لازمی طور پر کرنی ہوگی۔ اُسکی مرضی ہو سکول کو چھوڑ دے۔ مگر جب تک رہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ میں ایسا کروں گا اور ایسا نہیں کروں گا۔ یہ تو اُستاد کا فرض ہے۔ کہ جو باتیں طالب علموں کو ناپسند ہیں یا اچھی نہیں لگتیں اُنہیں دلچسپ بنائے۔ اور پسندیدہ طریقے سے ذہن نشین کروائے۔

یہ کہہ دینا تو بڑا آسان ہے کہ ہم ایشور کو نہیں مانتے۔ کیونکہ پرماتما آکر یہ تو نہیں کہتا کہ تم نے اس طرح کیوں کہا ہے؟ وہ تو ہمارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔ جو کوئی اُس کے قانون کو توڑتا ہے اُسے اُسی وقت سزا مل جاتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ پرماتما انتقام یا بدلہ لیتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ آپ کو پہلے سے بہتر بنا دے۔ خدا یا ایشور کی ہستی کے متعلق ثبوت کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہے۔ اگر ہمیں اُس کی ہستی کا احساس نہیں تو یہ ہمارے لئے خرابی کا باعث ہے۔ ایسی حس نہ ہونی بھی ایک طرح کی بیماری ہے۔ جو کبھی دن اچھی ہو جائے گی۔

طالب علم کو دلیل بازی نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر سکول یا کالج یہ قاعدہ بناتا ہے کہ طلبا پرارتھنا کے وقت حاضر ہوں۔ تو اُنہیں قاعدے کی پابندی کرنی چاہیئے۔ ہاں اُستادوں کے سامنے اپنے شکوک پیش کر سکتا ہے۔ اور جو بات سمجھ میں نہ آئے اُسکو ٹھیک

کہ پرماتما کیا ہے اور آتما کیا ہے اور سب انسان ایک ہیں ۔ پھر جب کسی نے کہہ دیا ۔ کہ اس وقت پرارتھنا کرو تو ویسا ہی کرنا پڑتا ہے کیا کبھی ایشور کے ساتھ پیار ایسے مصنوعی طریقوں سے بھی پیدا ہو سکتا ہے ؟ انسانی طبائع میں اس قدر اختلاف ہے کہ سب کو ایک رستے سے پھانسی دینا بعید از عقل معلوم ہوتا ہے ۔ اس لئے پرارتھنا جبری نہیں ہونی چاہئے ۔ جن کا جی چاہے وہ بیشک پرارتھنا کریں مگر جنکا دل گواہی نہ دے وہ نہ کریں بغیر وشواس کے کسی کام کو کرنا اخلاق سے بالکل بعید ہے ۔ بلکہ اپنے آپ کو گرانا ہے ۔

جواب ۔ پہلے سب سے آخری خیال کو لیجئے ۔ یعنی بغیر اسکے کہ انسان کو یقین کامل ہو کسی کام کو کرنا بد اخلاقی اور گراوٹ کا باعث ہوتا ہے ۔ فرض کیجئے کہ کوئی طالب علم یہ کہے کہ میرے خیال میں تو جو مضامین سکول میں پڑھائے جاتے ہیں اُنکے پڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں تو اس سے یہ مراد تو نہیں کہ سکول میں پڑھنا اخلاق سے بعید ہے اور ایک طرح کی گراوٹ ہے ۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ اگر کوئی طالب علم یہ سمجھ بیٹھے کہ مادری زبان سیکھنے سے کچھ فائدہ نہیں تو سکول میں اُسے زبان سیکھنے سے معافی دے دی جائے ۔ اس سے تو یہ صاف کہنا بہتر ہو گا ۔ کہ کسی طالب علم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کہے کہ میں یہ مضمون پڑھونگا اور یہ نہیں پڑھونگا ۔ یا یہ کرونگا اور یہ نہیں کرونگا ۔ جب وہ ایکدفعہ ایک سکول میں داخل ہو گیا

۲۷

پرارتھنا میں وشواس نہ ہونا

("ینگ انڈیا" - ۲۳ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء)

ذیل میں ایک خط درج کیا جاتا ہے جو ایک طالب علم نے ایک قومی ادارے کے پرنسپل کو لکھا۔ جس میں اُس نے پرارتھنا کرنے سے معاف کر دیئے جانے کی درخواست کی ہے۔

درخواست - عرض یہ ہے کہ پرارتھنا میں میرا وشواس نہیں ہے۔ کیونکہ میرے عقیدے کے مطابق پرماتما کی کوئی ہستی نہیں۔ پرارتھنا کس کے آگے کی جاتی ہے؟ میں ایک فرضی پرماتما کو اپنے سامنے کس طرح رکھوں؟ اگر میں پرماتما کی کوئی پرواہ نہ کروں تو مجھے کیا نقصان ہے۔ میں چُپکے چُپکے اور صدق دل سے اپنا کام کرتا ہونگا۔ سب کیساتھ ملکر پرارتھنا کرنا تو بالکل بیفائدہ ہے۔ بھلا لوگ جمع ہوکر بھی کبھی کسی چیز پر اپنی توجہ لگا سکتے ہیں؟ وہ چیز چاہے کتنی بھی حقیر کیوں نہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے جاہل بچے بھلا کیسے دھرم پُستکوں کی باریک باتیں سمجھ سکتے ہیں؟ مثلاً وہ کیا سمجھ سکتے ہیں

کیجئے۔ اگر تم ایسا کروگے تو جو مانگوگے وہ مِلے گا۔
یہ تو درست ہے کہ اٹھارہ ادھیاؤں کا زبانی یاد کرنا مشکل
ہے مگر کوشش ضرور کرنی چاہئے۔ جب ایک دفعہ آپ اس امرت
بھری گیتا کا مزا چکھ لیں گے آپ کا پیار بڑھتا ہی جائے گا۔ اُسکا
پاٹھ دُکھ اور مصیبت کے وقت آپ کو تسکین دے گا۔ اور قید کی
اکیلی کوٹھڑی میں آپ کا سہارا ہوگا۔ اور اگر گیتا کے شلوک پڑھتے
پڑھتے آپ کو موت کا سندیسہ بھی آپہنچے تو آپ کو برہم نروان یا
مُکتی حاصل ہوگی۔ وہ نروان کیسا ہوگا۔ آپ کے رودوان آچاریہ
آپ کو مجھ سے بہتر بتلا سکتے ہیں۔



کرتا ہے۔ اور عجز اور انکساری کیساتھ اُس کے نزدیک جاتا ہے
جس نے ایسا کیا وہ کبھی اُس کے دروازے سے نراش (ناامید)
ہو کر نہیں پھرا۔

طلبا تو چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھبرا جاتے ہیں۔ ذرا کسی امتحان
میں فیل ہو گئے تو بس بالکل نراس ہو گئے۔ گیتا اُنہیں سکھلاتی ہے
کہ ایسے موقعوں پر اُنہیں نراش نہیں ہونا چاہئے۔ گیتا ہمیں یہ بھی
سکھلاتی ہے کہ ہمیں کام تو کرنا چاہئے۔ مگر پھل یا نتیجے کی خواہش نہیں
کرنی چاہئے۔ کیونکہ ایک طرح سے کامیابی ناکامیابی برابر ہی ہیں
ہمیں تو تن من اور دھن سے اپنے فرض کو ادا کرنا ہے۔ نہ کہ من
مانی باتیں کرتی ہیں۔ اور خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے دوڑنا ہے۔ سنیہ گرہی
ہونے کی حیثیت میں میں یہ صاف کہتا ہوں کہ گیتا سے ہم بہت
سے نئے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ سب وہم وگمان
ہے تو میں کہوں گا کہ ایسے وہم وگمان کو میں چھاتی سے لگانا چاہتا
ہوں۔ کیونکہ اس میں ایک قیمتی خزانہ بھرا پڑا ہے۔ طلبا کو چاہئے کہ
صبح اُٹھتے ہی پہلے گیتا کا پاٹھ کریں۔ میں تلسی داس کی رامائن کا بڑا
بھگت ہوں۔ اور اُسے پیار کرتا ہوں۔ رام نام کا جو منتر اُنہوں
نے دیا ہے وہ دنیا کے دکھوں کی دوا ہے۔ مگر آج میں آپ کو تلسی داس
پیش کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ آپ گیتا کا مطالعہ کریں
مطالعہ بھی شردھا کے ساتھ کیجئے۔ اور نقص نہ نکالئے۔ نہ ہی نکتہ چینی

بعض لوگ کہتے ہیں کہ معمولی آدمی کیلئے گیتا کا سمجھنا نہایت مشکل
ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ مرحوم لوکمانیہ تلک نے جو بڑے زبردست
پنڈت بھی تھے ایک بے نظیر ٹیکہ گیتا پر لکھا ہے۔ انہیں اس کتاب میں
سچائیوں کا خزانہ ملا۔ اور انہوں نے اپنی ساری لیاقت اس پر خرچ
کر دی۔ مگر آپ کو اس بات سے ڈر نہیں جانا چاہیئے۔ اگر آپ اٹھارہ ادھیائے
پورے نہیں پڑھنا چاہتے تو پہلے تین ادھیائے ہی غور سے پڑھ لیجئے
ان تین ادھیاؤں میں ہی خلاصہ کے طور پر سب کچھ مل جائے گا جس کی
تفصیل باقی پندرہ ادھیاؤں میں مختلف پہلوؤں سے موجود ہے۔
ان تین ادھیاؤں کا خلاصہ بھی چند ایک شلوکوں میں موجود ہے
جو چنے جا سکتے ہیں۔ علاوہ بریں تین جگہ گیتا میں کہا گیا ہے کہ
سب دھرموں کو چھوڑ کر صرف ایک ایشور کی شرن لو۔ آپ ہی بتائیے
کہ یہ کہنا کہاں تک ٹھیک ہے کہ گیتا کی تعلیم نہایت ہی پیچیدہ اور
مشکل ہے۔ اور سمجھنی آسان نہیں۔ سچ پوچھو تو گیتا سب کی ماتا کے
سمان ہے۔ وہ کسی کو نراش نہیں کرتی۔ جو دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے
اس کیلئے کھول دیتی ہے۔ مایوسی تو گیتا سے پیار کرنے والے کے
نزدیک آتی ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ آنند اور خوشی میں رہتے ہیں۔
اور خوشی بھی ایسی جو بیان سے باہر ہے۔ مگر جس شخص میں وشواس
ا بھگتی نہ ہو۔ اور جو اپنے علم کا غرور کرے اسے وہ خوشی یا آنند کہاں
ں سکتا ہے؟ یہ تو اسے ملتا ہے جو اپنا تن من اور دھن نچھاور

دیتی ہے۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں سنسکرت سیکھ کر گیتا پڑھوں گا۔ آج گیتا میرے لئے انجیل اور قرآن کا کام ہی نہیں دیتی بلکہ میری ماتا کے سمان ہے۔ میری دنیاوی ماں تو دیر ہوئی اِس جہان سے رحلت کر گئی۔ مگر یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی ماں یعنی گیتا اُس کی جگہ لے رہی ہے۔ وہ کبھی بدلتی نہیں اور مجھے ہمیشہ تسلی دیتی ہے۔ جب مجھے کوئی مشکل پیش آتی ہے یا کسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو میں اُسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں اور اُسی کا سہارا لیتا ہوں۔

اچھوتوں کے سدھار کے متعلق پنڈتوں میں اختلاف رائے ہے بعض تو کہتے ہیں کہ ہندو دھرم اچھوتوں کو ساتھ ملانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اُن کے متعلق جو بیڑا میں نے اُٹھایا ہے وہ نہایت ہی مبارک ہے۔ اب کس کی بات مانی جائے۔ وید اور سمرتیاں کچھ نہیں بتلاتیں۔ آخر میں گیتا ماتا کے پاس جاتا ہوں اور کہتا ہوں۔ اے ماتا! اِن پنڈتوں نے مجھے گھبراہٹ میں ڈال رکھا ہے تم ہی کچھ مدد کرو۔ میری ماتا مسکرا کر کہتی ہے۔

کے نویں ادھیائے میں جو وعدہ دیا گیا ہے وہ صرف لئے ہی نہیں بلکہ سب قسم کے گناہ گاروں اور غریبوں ذات والے اچھوتوں کے لئے بھی ہے۔ مگر اس اعلیٰ مقام ہونے کیلئے شرط یہ ہے کہ ہم ماتا کے فرمانبردار اور وفادار مانبرداری حقیقی ہو نہ کہ ظاہری۔

دل پر گیتا کا کیا اثر ہوا ہے۔ شائد آپکو معلوم نہیں کہ جب پٹیل صاحب قید میں تھے تب اُن کے دل پر گیتا کا کیا اثر ہوا۔ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ یرؤدا جیل میں گیتا کا پڑھنا اُنہیں کھانے پینے سے بھی زیادہ طاقت بخش تھا۔ گیتا کو اصل زبان میں پڑھنے کے لئے اُنہوں نے سنسکرت سیکھی۔ اور اُنہوں نے سنسکرت سرو الکر صاحب کی کتاب کی مدد سے سیکھی جس میں اُستاد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب وہ گیتا پڑھنے لگے تو کتاب اُن کے ہاتھ میں ہی رہا کرتی تھی صبح سے لیکر شام تک گیتا ہی پڑھتے رہتے تھے۔ شائد آپ کو یہ خیال ہو کہ قید خانے میں اور کیا کرتے۔ مگر یہ بات نہیں۔ وہ گیتا پہ بہت بچار کیا کرتے تھے۔

ہندوؤں کیلئے گیتا تو ویسی ہی ہے جیسے عیسائیوں کیلئے انجیل یا مسلمانوں کے لئے قرآن۔ کیا ویدوں کا بھی وہی درجہ ہے؟ نہیں نہ ہی بھاگوت پران یا دیوی پران کو ہم وہ درجہ دے سکتے ہیں۔ بچپن میں تو میں ایک ایسی دھرم پُستک کی تلاش میں تھا جو مجھے زندگی کی مشکلات کے حل کرنے میں مدد دیتی اور میری تسکین کا باعث بھی ہوتی۔ وید اُس ضرورت کو پورا نہ کر سکے۔ اُن کے پڑھنے میں پندرہ سولہ سال کاشی جیسی جگہ میں رہ کر خرچ ہوتے تھے۔ میں اتنا وقت کہاں سے لاتا؟ گیتا کے متعلق میں نے کہیں پڑھا تھا۔ کہ سات سو شلوکوں میں سب شاستروں اور اُپنشدوں کا نچوڑ دے

۲۶

گیتا ماتا

(”ہری جن“ ۲۴ر اگست ۱۹۳۴ء)

آچاریہ انند شنکر دھرو نے مجھ سے کہا۔ کہ کاشی وشو ودیالہ[1] کے طلبا سے میں کچھ گیتا کے متعلق کہوں۔ مجھے اُنکی یہ دعوت قبول کرنے میں کچھ تامل سا تھا۔ بھلا اتنے بڑے پنڈت کے موجود ہوتے ہوئے میں اس اہم مضمون پر کیا کہہ سکتا تھا۔ نہ تو میں اُن جیسا لائق پنڈت ہوں۔ نہ ہی میں نے پراچین دھرم پُستکوں کا پنڈت مالویہ جی کی طرح کبھی غور سے مطالعہ کیا ہے۔ سردار ولبھ بھائی نے آج صبح مجھے بڑے مزے سے پوچھا۔ کہ میرے اور اُس جیسے بھنگی۔ کسانوں اور جولاہوں کا کاشی جیسے پنڈتوں کے شہر میں کیا کام۔ بھلا ہم کہاں اور مالویہ جی اور آچاریہ دھرو کہاں۔ میں کاشی میں کبھی بڑے پنڈت ہونے کی حیثیت میں تو نہیں آیا۔ بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے اور پٹیل جیسے شخصوں کے

---

[1] Benares Hindu University

چاہیئے۔ جب تک نہ سیکھیں تب تک اُنہیں گیتا سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے۔



دریافت کرنے پر معلوم ہؤا کہ کوئی سو ہندو لڑکوں میں سے صرف آٹھ نے بھگوت گیتا پڑھی تھی۔ جب میں نے پوچھا کہ کتنے لڑکے ہیں جو گیتا پڑھتے ہیں اور اُسے سمجھتے بھی ہیں۔ تو کسی نے اُن آٹھ میں سے ہاتھ نہ اُٹھایا۔ پانچ یا چھ مسلمان طلبا جو اُس سکول میں پڑھتے تھے سب نے کہا کہ اُنہوں نے قرآن پڑھا ہے مگر صرف ایک نے کہا کہ وہ معنی بھی جانتا ہے۔ میری رائے میں گیتا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ بعض بنیادی مسائل ضرور ایسے ہیں جنکا حل کرنا مشکل ہے۔ مگر پھر بھی مطلب صاف سمجھ میں آجاتا ہے۔ ہندو کے سب فرقے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو مان لینے کے قابل نہ ہو۔ بڑی مکمل کتاب ہے اور مدلّل اخلاقی قوانین جامع طور پر پیش کرتی ہے۔ اور دل اور دماغ دونو کو تسکین دیتی ہے۔ اس میں فلسفہ بھی ہے اور بھگتی بھی ہے۔ اور سب کو بھاتی ہے۔ زبان بھی بڑی سادہ اور سرل ہے۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ اس کا ایک مستند ترجمہ ہر زبان میں ہونا لازمی ہے۔ اور ترجمہ بھی ایسا ہو کہ اُس میں دینی اصطلاحیں صاف کر دی جائیں۔ تاکہ عام لوگ اُسے سمجھ سکیں۔ ہاں ایسا نہ ہو کہ اصل مطلب مفقود ہو جائے۔ حاشیہ آرائی ہرگز نہ ہو۔ میں اپنے خیال کو دہرانا چاہتا ہوں۔ ایک تو ہر ہندو لڑکے اور لڑکی کو سنسکرت سیکھنی چاہئے۔ ابھی لوگ سنسکرت نہیں سیکھتے۔ اُس کیلئے سوقت

ہؤا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ طلبا کی لاعلمی اِس بات کا ثبوت نہیں۔ کہ اہلِ ہندوستان بھی روحانیت یا دھرم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے طلبا جو سرکاری مدرسوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ وہ دھرم کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ پادری صاحب کا اشارہ مسیبور کے طلبا کی طرف تھا۔ اور مجھے یہ سن کر دُکھ ہوا۔ کہ اُس ریاست کے طلباء دھرم کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سکولوں میں کوئی مذہبی تعلیم نہیں دی جانی چاہئے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں بہت سے مختلف دھرم موجود ہیں۔ اور ہر دھرم میں فرقے ہیں۔ ایسی حالت میں دھارمک یا مذہبی تعلیم کا دینا کوئی آسان بات نہیں لیکن اگر دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دھارمک تعلیم نہ دی گئی تو ایک دن ملک سے روحانیت بالکل معدوم ہو جائے گی۔ یہ تو درست ہے کہ دھرم صرف کتابوں سے نہیں سیکھا جاتا۔ لیکن بچوں کو اگر دھرم سکھلانا ہو تو اور کونسا بہتر طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے؟ اور اگر سکولوں میں دھرم نہ بھی سکھلایا جائے پھر بھی بڑے لڑکوں کو جسطرح اور باتوں میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا سکھلایا جاتا ہے ویسے ہی دھرم میں بھی یہ اصول سکھلانا لازمی ہے۔

میں شموگا میں ہائی سکول کے طلبا کو خطاب کر رہا تھا۔ وہاں

طلبا اور گیتا

("ینگ انڈیا" ۲۵ راگست ۱۹۲۷ء)

کچھ دن ہوئے ایک پادری صاحب جو میرے دوست ہیں دوران گفتگو میں مجھ سے پوچھنے لگے کہ آیا واقعی ہندوستان روحانیت میں اور ملکوں سے آگے بڑھا ہوا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ بہت کم طالب علم اپنے دھرم کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔ اور انہیں بھگوت گیتا کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اپنی بات کے ثبوت میں میرے دوست نے جو لڑکوں کو پڑھاتا ہے یہ بھی کہا۔ کہ وہ طلبا سے اکثر پوچھتا رہتا تھا کہ انہیں اپنے دھرم یا بھگوت گیتا کے متعلق کچھ معلوم ہے۔ اور ان میں سے اکثر یہی جواب دیتے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

جو اس گفتگو سے نتیجہ نکلتا ہے اُس کا خیال نہ کرتے ہوئے یعنی یہ کہ چونکہ طلبا کو اپنے دھرم کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا اسلئے ہندوستان اور ملکوں کے مقابلے پر روحانیت میں بڑھ کر کیوں

سب دور ہو جائیں گی۔ اور محبت کی گرمی انہیں جلا دے گی۔
مثلاً چھوٹی عمر کی شادی کی رسم اُنہیں بہت بُری لگے گی۔ وہ
شادی کے وقت لڑکی کے والدین کو ایک کثیر رقم جہیز کے طور پر دینے
کیلئے مجبور نہ کریں گے۔ اور شادی کے بعد اپنی بیویوں کے ساتھ بُرا
سلوک روا نہ رکھیں گے۔ جو نوجوان اہنسا کے ماحول میں پرورش
پائیں گے وہ پھر کیونکر اپنے بھائیوں سے یا دوسرے مذہب والوں
سے لڑائی جھگڑا کریں گے؟ وہ شخص جو اپنے آپکو اہنسا کا پجاری یا
دلدادہ کہیگا بھلا وہ کیوں ایسی بیہودہ حرکتیں کر سکیگا۔
الغرض اہنسا ایک زبردست ہتھیار ہے۔ اہنسا ہماری زندگی
کا پھل ہے۔ صرف بہادر شخص ہی اس ہتھیار کو استعمال کر سکتا ہے۔
بلکہ اُس کے لئے تو سب کچھ یہی ہے۔ اہنسا بزدل کے نزدیک بھی
نہیں پھٹکتی۔ یہ کوئی کھیل یا کھلونا نہیں۔ یہ تو زندگی دینے والا زندہ
اوزار ہے۔ اہنسا ہمارے آتما کی صفات میں سے ایک صِفت ہے
اسی لئے تو اسکو سب سے اونچا دھرم یعنی فرض یا قانون قرار دیا گیا ہے
ایک معلم کے ہاتھ میں یہ محبت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور ہمیشہ تر و تازہ
اور زندگی کا سرچشمہ بنکر نکلتا ہے۔ جب اہنسا کا سورج نکلتا ہے۔ تو
نفرت غصہ اور عناد کا اندھیرا دور ہو جاتا ہے۔ تعلیم کے میدان میں
اہنسا ایک چمکدار ستارے کیطرح ہے جسکی روشنی دور تک جاتی ہے۔
جب وِدیا پیٹھ میں اہنسا کی روشنی ہو جائیگی تو طلبا کی سب مشکلات
کا خاتمہ ہو جائیگا*

اُس کا دل محبت سے بھرا ہوٗ اور وہ دوسروں کے دُکھ بٹاتا ہو اور اُس کے دل میں غصہ اور دشمنی کا جذبہ بھی نہ ہو تو ایسا شخص تو مجسّم اہنسا ہی ہوٗا۔ ایک دوسرا شخص جو کھانے پینے میں بڑا محتاط ہے مگر ہے سنگدل۔ خودغرض اور نفس پرست۔ وہ اہنسا سے کوسوں دُور ہوگا۔

ہمارے ملک میں فوج ہو یا نہ ہو۔ اور حکومت کے ساتھ جنگ کیجائے یا نہ کیجائے۔ یہ سوال بڑے اہم ہیں اور ہمیں ایک نہ ایک دن اِنکو حل ضرور کرنا ہوگا۔ کانگریس نے اپنے عقائد میں اس سوال کا حل پیش بھی کیا ہے۔ ہیں تو یہ سوالات بڑے ضروری مگر عام لوگ اس میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ طلبا یا اُن کے اُستاد اہنسا کے اس پہلو کو نظرانداز کر سکتے ہیں۔ یہ سوالات سیاسیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہانتک تعلیم اور اہنسا کا تعلق ہے اُس میں طلبا کا کیا وظیفہ ہے اُسے جاننا چاہیئے۔ جہاں اہنسا کی خوشگوار ہوائیں چلتی ہونگی وہاں طلبا آپسمیں یعنی لڑکے اور لڑکیاں دونو بہن اور بھائی بنکر رہیں گے۔ آزاد بھی ہونگے اور نفس کو بھی قابو میں رکھیں گے۔ طلبا اور اُستادوں کا رشتہ بھی محبت رواداری اور اعتماد پر قائم ہوگا۔ ایسے ماحول میں اہنسا خوب نشو و نما پائیگی طلبا بھی بڑے فراخ دل اور وسیع الخیال ہونگے۔ اور ہر وقت خدمت کے لئے حاضر رہیں گے۔ سوشل (social) خرابیاں

مارنا اچھا ہے یا نہیں ہمیں اپنے اصلی فرض سے دور لیجاتا ہے۔ ہر روز تو ہمیں سانپ یا بچھو مارنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ جو اس قسم کے خطرناک جانور ہیں کیا ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں؟ اُنپر ہمت آزمائی کرنا یا اُن سے پیار کرنا کچھ بڑی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہاں غصہ اور عناد جو ہمارے دل کے اندر ہے اُن کا مارنا بہادری ہے۔ بھلا اس بحث میں وقت کھونا۔ کہ کیڑوں مکوڑوں کو مارنا اچھا ہے یا نہیں کیا فائدہ! ہم اپنے اصلی فرض کو تو ادا کرتے نہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم خطرناک جانوروں کو نہیں مارتے۔ جو اہنسا کا سبق سیکھنا چاہتے ہیں وہ کچھ دیر تک اس بات کو بھول جائیں۔ کہ سانپ وغیرہ مارنا پاپ ہے یا پن۔ اگر کوئی مارنے بغیر نہیں رہ سکتا تو اس کی بلا سے۔ پہلے تو اندر کے خراب جذبات مثلاً غصے اور بیگانگی کو مارلو۔ کیونکہ سب سے پیار کرنے کے لئے یہ پہلا قدم ہے۔ بینگن یا آلو کھاؤ نہ کھاؤ۔ یہ مت سمجھنے لگو کہ ایسا کرنے کی وجہ سے تم اہنسا کے راستے پر گامزن ہو۔ بھلا یہ کیا بہادری کی بات ہوئی؟ کھانے پینے میں ہی تو صرف اہنسا نہیں۔ اُس سے پرے بھی ہے۔ اصل اہنسا تو نفس پر قابو پانا اور اُسے جیتنا ہے۔ بیشک کھانے پینے میں احتیاط اور پرہیز سے کام لو۔ نفسانی لذات پر قابو رکھنا اچھا ہے۔ مگر اہنسا صرف ایسا کرنیکا نام نہیں۔ ایک شخص سب کچھ کھا پی لیتا ہو مگر

۲۴

تعلیم اور اہنسا

("ینگ انڈیا" ۱۷ ستمبر ۱۹۲۸ء)

سوال - جب ہم اہنسا کا ذکر کرتے ہیں تو کئی چھوٹے چھوٹے سوال دل میں اُٹھتے ہیں - کیا کتّوں - شیروں - بھیڑیوں - سانپوں اور جوؤں وغیرہ کو مارنا چاہیئے یا نہیں؟ یا اہنسا کے یہ معنی ہیں کہ بینگن اور آلو کی سبزی کھاؤ - گوشت مت کھاؤ - بعض دفعہ سوال کرنے والا یہ بھی جاننا چاہتا ہے - کہ فوجوں کا رکھنا اور ہتھیاروں سے لڑنا بھی اہنسا کے اصولوں کے برخلاف ہے - کوئی صاحب کبھی یہ جاننے کی تکلیف نہیں اُٹھاتے کہ تعلیم پر اس اصول کو کس طرح سے (منطبق) گھٹایا جاوے - آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیئے -

جواب - سوال کے پہلے حصے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُسکے دائرے کو محدود کر دیا گیا ہے - اور پوچھنے والے کا نظریہ بڑا تنگ ہے - اس بات پر زور دینا کہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کو

لئے دوسرے دھرموں کا احترام لازم ہے۔ اس احترام میں اپنا دھرم بھی تو شامل ہے۔ دوسرے دھرموں کے مطالعہ سے یہ احترام کسی صورت میں کم نہیں ہوگا۔ بلکہ بڑھیگا۔ اس لحاظ سے دھرم اور تمدن کا ایک ہی درجہ ہے۔ اگر ہم اپنے تمدن کے حامی ہیں تو اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ ہم دوسروں کے تمدن سے نفرت کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے تو یہ مراد ہے کہ ہم دوسرے تمدنوں سے بھی اچھی اچھی باتیں لینے کیلئے تیار ہیں۔ ایسا ہی دھرم میں ہونا چاہیئے۔ ہماری موجودہ کشمکش کی وجہ تو ہمارا زہر آلودہ ماحول ہے۔ آپس کی نفرت۔ عناد اور بے اعتمادی گُل کھلا رہی ہے۔ یہ ایک موہوم سا ڈر ہے کہ لوگ ہمارے دھرم کو بگاڑ رہے ہیں۔ یا ہمارے عزیز اور اقارب کے مذہب کو خراب کر رہے ہیں۔ اگر ہم دوسرے دھرم والوں سے رواداری کا سلوک کرینگے اور اُن کے دھرم کا احترام کرینگے تو یہ غیر قدرتی اور عارضی حالت بدل جائے گی۔



دھارمک یا مذہبی تعلیم میں دوسرے دھرموں کے اصولوں کی تعلیم بھی شامل ہونی چاہیئے۔ طلبا کو چاہیئے کہ وہ مختلف مذاہب کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور بڑی متانت اور فراخدلی سے اُنکی تعلیمات کا مطالعہ کریں۔ ایسا کرنے سے اُنہیں ایک تو روحانی تسکین حاصل ہوگی اور دوسرے وہ اپنے دھرم کو بھی اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ مگر دیگر مذاہب کا مطالعہ کرتے ہوئے اُنہیں ایک بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ اُن دھرموں کے ماننے والوں کی تصنیفات کا مطالعہ کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بھاگوت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو وہ بھاگوت کے ماننے والے کے ترجمہ کو پڑھے۔ اور مخالف مترجم کے ترجمہ کو نہ پڑھے۔ اسی طرح سے اگر انجیل کا مطالعہ کرنا ہو تو عیسائی مصنّفوں کی کتابوں کو دیکھے۔ ایسا کرنے سے سب دھرموں کے اساسی اور بنیادی اصول سمجھ میں آجائیں گے۔ اور اُنکی تہہ میں جو یگانگت ہے اس کا پتہ چل جائیگا۔ اور وہ عالمگیر حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی جو عقائد کے جھگڑوں سے بالاتر ہے۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ اگر ہم دوسرے دھرموں کا مؤدبانہ مطالعہ کریں گے۔ تو ہمارا اپنے دھرم میں وشواس یا شردھا کم ہو جائے گی۔ ہندو فلسفہ کے مطابق تھوڑی بہت سچائی ہر جگہ ہے۔ اور ہندو دھرم ہمیں یہ بھی سکھلاتا ہے۔ کہ ہمارے

۲۳

دھارمک یا مذہبی تعلیم

("ینگ انڈیا"۔ ۱۲؍دسمبر ۱۹۲۸ء)

گجرات ودّیا پیٹھ کا ایک طالب علم یوں رقمطراز ہے:۔

سوال۔ ودّیا پیٹھ میں دھارمک یا مذہبی تعلیم کو کیا شکل اختیار کرنی چاہیئے؟

جواب۔ میرے لئے تو دھرم کے معنی سچائی اور اہنسا یا صرف سچائی کے ہیں۔ کیونکہ سچائی میں اہنسا بھی آجاتی ہے۔ سچائی بغیر اہنسا کے مل ہی نہیں سکتی۔ اس لئے اگر یہ صفات انسان کی زندگی میں پیدا ہو جائیں۔ تو سمجھیئے یہی دھرم کی تعلیم ہوئی۔ اور میری رائے میں ان صفات کو پیدا کرنیکا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اُستاد اپنے اندر سچائی اور اہنسا کی صفات رکھتے ہوں۔ جب ایسے اُستادلڑکوں کیساتھ جماعت میں یا کھیل کود کے وقت ملیں گے تو ان صفات کو اُن کے ذہن نشین کرا دیں گے۔

دھرم کے بنیادی اصولوں کو جاننا تو اسی کا نام ہے۔ مگر

ہے۔ اور اُس کے ایسا کرنے سے تناسخ یا آواگون یا مکتی کے مسائل میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ تو ایک بال بدھوا کے شادی کرنے سے کیا ہو جاتا ہے۔ مراسلہ نگار سے میں صاف کہے دیتا ہوں کہ اِن مسائل میں میرا اٹوٹ وشواس ہے مکتی تو ایک ایسی چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے میں دن رات کوشاں ہوں اور اُسپر غور کرتے ہوئے ہی مجھے ایسا احساس ہوتا ہے۔ کہ ہم بال بدھواؤں کیساتھ بڑا ظلم روا رکھ رہے ہیں۔ ہماری موجودہ گری ہوئی حالت میں ان بچاری بال بدھواؤں کا سیتا جیسی دیویوں کیساتھ مقابلہ کرنا بالکل ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔

علاوہ بریں اگر ہندو دھرم میں بدھواپن کی بڑی قدر و منزلت ہے تو اسبات کا ثبوت پھر بھی نہیں ملتا۔ کہ ویدوں کے زمانے میں بدھوا عورتوں کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میں تو عورتوں کے بدھوا رہکر زندگی گذارنے کے برخلاف نہیں ہوں۔ مگر جن کے خاوند چھوٹی عمر میں ہی گذر جائیں وہ بھلا کس طرح سے بدھوا ہوئیں۔ بہتر تو یہ ہوگا۔ کہ ایسی لڑکیوں کو بالکل بدھوا خیال ہی نہ کیا جائے۔ اور ہر ایک ہندو کا یہ فرض ہو۔ کہ اُن بیگناہ لڑکیوں کو اس مصیبتِ عظمیٰ سے ہر طرح بچائے۔ میں اس لئے بڑی نمرتا سے ہر ایک نوجوان کو دوبارہ بڑے زور سے نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ان نام نہاد بدھواؤں سے ہی شادی کرے +

مقصد ہے اُسی کو مدِنظر رکھ کر ہی تو میں نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ تم بال بدھواؤں سے شادی کرو یا بالکل شادی نہ کرو۔ جب بال بدھوائیں نہ ہونگی تب ہی تو بدھوا رہنا ایک پاکیزہ کام خیال کیا جائے گا۔

یہ کہنا کہ جو بدھوائیں برہمچریہ قائم رکھیں گی وہ مکتی یا نجات حاصل کرینگی ایسا تو کبھی ہو نہیں سکتا۔ مکتی حاصل کرنے کے لئے صرف برہمچاری رہنا ہی تو کافی نہیں۔ مجبوری طور پر برہمچاری رہنا تو اور بھی خراب ہے۔ اس سے تو اور خرابیاں پیدا ہو جائینگی اور لوگوں کے اخلاق اور بھی گر جائیں گے۔ مراسلہ نگار کو جان لینا چاہیئے کہ یہ سب کچھ میں ذاتی تجربے سے لکھ رہا ہوں۔

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوگی کہ میری نصیحت کی وجہ سے بال بدھواؤں کیساتھ انصاف روا رکھا گیا ہے۔ اور وہ لڑکیاں جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی وہ قبل از وقت شادی کرنے سے بچ گئی ہیں اور اُنہیں بڑے ہو جانیکا اور سمجھ سوچ کر شادی کرنیکا موقعہ مل گیا ہے۔

"تناسخ یا آواگون یا مکتی وغیرہ مسائل کا شادی کی رسم سے کچھ تصادم تو معلوم نہیں ہوتا۔ ناظرین تو جانتے ہی ہوں گے کہ چھوٹی ذاتوں کے لاکھوں ہندو بدھوا بیاہ کی اجازت دیتے ہیں۔ اور اگر ایک بڑی عمر کا رنڈوا (جس کی بیوی مر گئی ہو) دوسری شادی کر لیتا

سے ملتے ہیں۔ آپ کا یہ خیال ہندوؤں کے تناسخ یا آواگون کے مسئلہ کے بالکل برخلاف ہے۔ اور مکتی کے راستہ میں حائل ہوتا ہے۔ اور ہندو سماج کو دیگر جماعتوں کے برابر یا مساوی بنا دیگا اور ہمیں ایسا کرنا منظور نہیں۔ ہماری سماج کی حالت بڑی خراب ہے۔ پھر بھی ہمیں اپنے آدرش کو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ اور اوپر کیطرف جانا چاہیئے۔ دوسری سماجوں کا یا دوسرے آدرشوں کا ہم پر اثر ہونا نہیں چاہیئے۔ اہلیا بائی۔ رانی بھوانی۔ سیتا۔ ساونتری اور دمینتی جیسی دیویاں ہندو سماج کا آدرش ہونی چاہئیں۔ اور ہمیں اُنکے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔ اس لئے آپ سے دست بستہ درخواست ہے کہ آپ ایسے پیچیدہ سوالوں پر رائے زنی نہ کیا کیجیئے۔ اور ہندوؤں کو جس طرح وہ چاہیں کرنے دیجیئے۔"

جواب۔ بیشک یہ غصہ بھری مخالفت سخت بھی ہے مگر مجھ پر کوئی اثر نہیں رکھتی اور نہ ہی میں اپنی رائے بدلنے کیلئے تیار ہوں۔ اول تو میری نصیحت اُن بدھواوں کے دل کو نہیں بدل سکتی جو شادی نہیں کرنا چاہتیں یا برہمچریہ قائم رکھنا چاہتی ہیں مگر بیچاری وہ بال بدھوائیں جن کی چھوٹی عمر میں شادی کر دیگئی تھی اور جو یہ نہیں جانتیں کہ شادی ہونی کیا ہے اُن کے لئے تو میری نصیحت راحت بخش ہوگی۔ بدھوا کا لفظ بھی اُنکے نام کے ساتھ ایک طرح اس پوتر شبد کو بدنام کرتا ہے۔ مراسلہ نگار کا جو

ایک غصّہ بھری مخالفت

("ینگ انڈیا"۔ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۲۷ء)

ایک بنگالی سکول کے ہیڈ ماسٹر لکھتے ہیں:۔
"آپ کا مدراس میں طلبا کو خطاب کرتے ہوئے اُنہیں بال بدھوا لڑکیوں سے شادی کرنے کی صلاح دینا نہایت خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ اور میں اس پر بڑے انکسار سے غصہ بھری مخالفت کا اظہار کرتا ہوں۔
آپکی اس نصیحت کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ بیوہ عورتیں جو اپنی عصمت اور پاکیزگی کیلئے شہرہ آفاق ہیں اپنے برہمچریہ کو قائم نہ رکھ سکیں گی۔ اور اسی زندگی میں پاکیزہ رہ کر جو مکتی یا نجات اُنہیں حاصل کرنی تھی اُس سے وہ محروم رہ جائیں گی۔ اور وہ نفس پرستی اور دنیاداری کے اُلجھن میں پھنس جائیں گی۔ اس قسم کی ہمدردی کرنا گویا بال بدھواؤں کو سخت نقصان پہنچانا ہے۔ اور اُن لڑکیوں کیساتھ تو بے انصافی ہے جنہیں ابھی شادی کرنی ہے اور جنکو خاوند مشکل

اس کے بغیر گذارہ ہی نہیں ہوتا۔ سگرٹ پینا بھی ایسا ہی بُرا ہے جیسے افیون کھانا۔ اور جو سگریٹ آپ پیتے ہیں اُن میں کچھ افیون بھی ہوتی ہے۔ جب عادت بڑھ جاتی ہے تو پھر چھوٹتی نہیں۔ پیتے نہیں طلبا کس طرح چمنی کی طرح دھواں نکال کر اپنے منہ کو بدبودار بنا دیتے ہیں۔ اگر آپ چائے۔ قہوہ اور سگریٹ پینے کی عادت ترک کر دیں تو دیکھئے کتنے پیسے روز بچ جاتے ہیں۔ ٹالسٹائی ایک کہانی میں لکھتا ہے۔ کہ ایک شرابی جو کسی کو قتل کرنا چاہتا تھا سگرٹ پینے بیٹھ گیا۔ اور جیسے ہی پی چکا خنجر ہاتھ میں لیکر کہنے لگا۔ کہ میں کیا بزدل ہوں اور یہ کہہ کر دشمن پر جا پڑا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ کہانی نہیں ٹالسٹائی کا چشم دید واقعہ ہے۔ وہ تو سگرٹ پینے کو شراب پینے سے بھی زیادہ خراب سمجھتا تھا۔ میں تو دونو ہی خراب یوں سمجھئے کہ اگر ایک ابلیس ہے تو دوسرا شیطان مجسّم ہے۔



بال ودھوائیں بھی موجود ہیں تو میں ایسے دھرم سے باز آیا۔ یہ دھرم کیا ہوا کھیل ہوا۔ مقدس کتابوں میں تو ایسے دھرم کا ذکر تک نہیں۔ یہ تو صاف جیوا ہنسا ہوئی۔ ہندو دھرم کچھ اور چیز ہے۔ ذرا ان باتوں پر غور کیجئے۔ میں تو اپنا دل آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اور میں دیکھتا ہوں۔ کہ جب میں تقریر کر رہا ہوں آپ ہنس رہے ہیں۔ اس سے مجھے رنج ہوتا ہے۔ میں تمہارے دماغ کو یہ باتیں نہیں سنا رہا ہوں۔ بلکہ تمہارے دل سے متوجہ ہو رہا ہوں تم پر ملک کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ اور یہ جو میں کہتا ہوں تمہارے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

کالی کٹ سے ایک پروفیسر صاحب نے مجھے چائے قہوہ[1] اور سگرٹوں کے متعلق کچھ کہنے کے لئے کہا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اول تو یہ چیزیں ضروریات میں سے نہیں۔ لوازمات ہیں۔ بعض لوگ تو دن بھر میں دس پیالیاں قہوہ کی پی جاتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ صحت قائم رکھنے کیلئے اور اپنا روز کا کام کرنے کیلئے اس قدر قہوہ پینا ضروری ہے؟ اگر انہیں کام ہی کرتے رہنا ہے اور رات بھر قہوہ پی پی کر جاگنا ہے تو وہ سو کیوں نہیں جاتے؟ اس قسم کی عادت کا غلام بن جانا کوئی عقلمندی ہے بہت سے لوگ چائے اور قہوہ کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں۔ کہ انکا

---

[1] Coffee

دل میں نہیں لاتیں۔ ہم کیوں اُنہیں مجبور کریں؟ بعض برہمن طالب علم مجھے کہتے ہیں کہ اُنہیں سولہ سال کی لڑکیاں شادی کرنے کے واسطے میسّر ہی نہیں ہوتیں۔ اُن کے والدین اُنہیں دس بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں ہی بیاہ دیتے ہیں۔ میں جواب میں کہتا ہوں۔ اے برہمنو! اگر تم اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتے تو برہمن کس لئے کہلاتے ہو؟ سولہ برس کی بال بدھوا کیساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ اگر ایسی برہمن بال بدھوا نہ ملے تو کسی اور ذات کی بال بدھوا سے شادی کر لو۔ ہندوؤں کا برما تما ضرور تمہیں معاف کر دے گا۔ کیونکہ ایک تو تم ذات سے باہر شادی کرو گے اور دوسرے تم بارہ برس کی لڑکی سے شادی کرنے سے بچ جاؤ گے۔ اگر تمہارا دل صاف یا پوتر نہیں ہے۔ اور تم اپنے نفس کو بھی نہیں روک سکتے تو تمہارے پڑھے لکھے ہونے سے کیا فائدہ۔ تم کہتے ہو کہ یہ کالج سب کالجوں سے اول نمبر ہے تمہیں بھی چال چلن میں اول نمبر ہونا چاہئے۔ تب ہی تو تمہارے کالج کا نام روشن ہو گا۔ تعلیم حاصل کرنیکا کیا فائدہ اگر چال چلن درست نہ ہوا۔ اور اگر خیالات پاکیزہ نہ ہوئے۔ تو چال چلن کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ میں برہمنوں کی عزت کرتا ہوں اور ورن آشرم دھرم کے حق میں ہوں۔ مگر برہمنوں کے دھرم میں اگر اچھوت پن اور چھوٹی عمر کی شادی جائز ہے اور اگر اس پر

اگر مرد اور عورتیں جو اس حکومت کو چلاتی ہیں لائق اور تجربہ کار نہ ہوں تو وہ آئین کس کام کا ہوگا۔ بھلا کہیں تیس کروڑ آدمیوں پر حکومت کرنا اور انتظام قائم رکھنا ہم جیسے نالائقوں سے ہو سکتا ہے؟ جب تک ہمارے ملک میں ایک بھی بدھوا ہے جسکو مجبوراً ایسی زندگی گذارنی پڑتی ہے تب تک غلامی کیسے دور ہو سکتی ہے؟ یہ کوئی دھرم ہوا۔ یہ تو ادھرم ہے۔ میں کٹر ہندو ہوتے ہوئے یہ بات کہتا ہوں۔ یہ نہ خیال کیجئے کہ مغربی تمدن کے زیر اثر ہو کر میں یہ کہتا ہوں۔ میں پورا پورا ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے یہ کہہ رہا ہوں۔ مغرب سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مگر یہ بات نہیں سیکھی۔ ہندو دھرم میں اس قسم کے بدھوا پن کی کہیں اجازت نہیں دی گئی۔

جو کچھ بال بدھواؤں کے متعلق کہا گیا ہے وہ بچپن کی شادی کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔ آپ کو اپنے اوپر اتنا قابو تو ضرور ہونا چاہیئے کہ آپ سولہ برس سے چھوٹی عمر کی لڑکی کیساتھ شادی نہ کریں۔ اگر میرے بس کی بات ہوتی تو میں بیس برس سے کم عمر کی لڑکی سے شادی کرنے کی اجازت نہ دیتا۔ ہندوستان میں تو بیس برس بھی کم ہے۔ یہاں لڑکیاں آب و ہوا کیوجہ سے جلدی بالغ نہیں ہوتیں۔ اس میں بھی ہمارا ہی قصور ہے میں کئی لڑکیوں کو جانتا ہوں جو بیس برس تک شادی کا خیال ترک

سے بھی کہہ دو اور اپنی بہنوں سے بھی کہہ دو۔

ایک طرح سے تو ایسی لڑکیوں کو بدھوا کہنا ہی غلطی ہے۔ اول تو دس اور پندرہ سال کی لڑکی کی بغیر اُس کی رضامندی کے شادی کر دینے کے کیا معنی ہیں۔ پھر اگر شادی ہو بھی گئی۔ اور لڑکی اپنے خاوند کیساتھ بھی نہ رہی ہو تو وہ لڑکی کس طرح بدھوا ہوئی؟ اُسے بدھوا کہنا تو سخت حماقت ہے۔ ہندو دھرم میں تو لفظ "بدھوا" ایک پاکیزہ لفظ ہے۔ جو اصلی بدھوا ہوں اُنہیں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ مثلاً رامابائی جی جنکو معلوم تھا کہ بدھوا ہونا کیا ہوتا ہے۔ مگر ایک ۹ سال کی لڑکی جسکی شادی ہو گئی ہو مگر یہ نہ جانتی ہو۔ کہ خاوند کس کو کہتے ہیں وہ کیسے بدھوا کہلا سکتی ہے؟ اگر مدراس احاطے میں ایسی بدھوائیں نہیں ہیں تو اور بات ہے لیکن اگر ہیں تو آپ کا فرض ہو جاتا ہے کہ آپ ایسی لڑکیوں کیساتھ شادی کریں۔ تب ہی یہ بلا آپ کے سر سے ٹل سکتی ہے۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ جو قومیں اس قسم کے گناہوں کی مرتکب ہوتی ہیں اُنہیں اسکا بدلہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے۔ آپ اس کو وہم سمجھیں تو آپکی مرضی ہے۔ میرے خیال میں ہماری غلامی ہمارے ماضی کے جمع شدہ گناہوں کا ہی نتیجہ ہے۔ پارلیمنٹ کی طرف سے ہمیں نفیس سے نفیس آئینِ حکومت بھی کیوں نہ ملے

دیا کہ لو سُوت کاتو تو کیا وہ بھوک سے بچ جائینگی؟ نہیں۔ بلکہ اُنہیں تو اور نقصان ہوگا۔ اُنکو دان لینے کی عادت پڑ جائیگی۔ اور دان کے روپیہ سے کام کرنا نہ صرف اُنہیں بلکہ قوم کی قوم کے لئے ہانی کارک (نقصان دِہ) ہوگا۔ میری اور آپ کی غرض تو یہ ہے کہ ہماری استریوں کو گھر بیٹھے کُچھ کام کرنے کو ملے اور اس سے بہتر کام اور کیا ہو سکتا ہے؟ چرخہ کاتنا بڑا ہی اچھا اور باعزت کام ہے۔ اور کافی بھی ہے۔ ایک آنہ آپ کے لئے کچھ نہ ہو۔ شاید آپ ٹریم میں ٹکٹ لیکر دو تین یا چار پانچ میل سوار ہوکر ایک آنہ خرچ کر دیں گے پیدل جانا پسند نہ کریں گے۔ حالانکہ پیدل چلنے سے ورزش بھی ہو جائے گی۔ مگر ایک غریب عورت کے لئے تو ایک آنہ بڑی چیز ہے ہے۔ وہ تو اُس ایک آنے سے روئی خرید کر اپنے متبرک ہاتھوں سے سُوت کات کر مجھے دیگی۔ اور وہ سُوت کسقدر قیمتی ہوگا۔ اُس سُوت سے تو راجاؤں اور مہاراجاؤں کے پہننے کے لئے کپڑا تیار ہوتا ہے۔ جو کپڑا مشین سے تیار کیا جاتا ہے اس میں کیا خوبی ہو سکتی ہے؟ انسانی ہاتھ کی بنی ہوئی چیز زیادہ ممتاز ہے۔ میں اور زیادہ کیا کہوں۔ میں تو گھنٹوں اِس مضمون پر بول سکتا ہوں۔ الغرض یہ تھیلی جو آپ نے دی ہے تب ہی صحیح استعمال میں آسکتی ہے جب آپ یہ عہد کر لیں کہ آپ سوائے کھدر کے اور کوئی کپڑا نہیں پہنیں گے۔

سکتا ہے؟ مگر آپ نے اس بات کو قبول کیا ہے۔ اور مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ اگرچہ آپ نے اپنے ایڈریس میں صاف طور پر تو نہیں کہا ہے۔ پھر بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپکے دلوں میں چرخے کیلئے پیار ہے۔ یہ تھیلی جو آپ نے دی ہے اسی پر ہی چرخے سے آپ کا پیار ختم نہیں ہو جانا چاہئے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو مجھے بڑی گھبراہٹ ہو گی۔ کیونکہ اگر یہ روپیہ کھدر بنانے والوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور ان غریبوں نے کھدر بنایا اور آپ نے نہ خریدا تو یہ روپیہ تو ضائع گیا۔ آخر یہ زبانی جمع خرچ اور مجھے کچھ دینے سے کیا حاصل۔ ایسا کرنے سے کیا کبھی سوراجیہ نزدیک آسکتا ہے؟ اور کیا کبھی ممکن ہے کہ اس طرح لاکھوں اور کروڑوں آدمی جو بھوکے مر رہے ہیں انکی روٹی کا سوال حل ہو جائیگا؟ سچ پوچھو تو لوگ بھوکے ہی نہیں مر رہے بلکہ بیکار و بیروزگار بھی ہیں۔ چونکہ ہم کھدر پہننے کے لئے تیار نہیں اس لئے ان بھوکے مرنے والوں کے پاس کوئی کام بھی نہیں۔ سارا سال تو کام کرتے ہی نہیں اگر آٹھ مہینے کام کرتے ہیں تو چار مہینے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ میں کوئی اپنے خیال سے نہیں کہہ رہا۔ بلکہ یہ امر واقعہ ہے۔ اور ہمارے انگریز حکام بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔ شائد آپ اپنے ہموطنوں کی باتوں کو جو یہاں کے رہنے والے ہیں اور لوگوں سے ملتے جلتے ہیں ٹھکرا دیں مگر حاکموں کی بات کو تو مانیں گے۔

بس اگر میں یہ روپیہ لے گیا اور میں نے اپنی ہموطن بہنوں کو دے

تقسیم کر رہا تھا۔ طلبا نے وہ سب کے سب پمفلٹ مجھ سے ہاتھوں ہاتھ لے لئے۔ بلکہ طلبا کی خاطر میں نے پریذیڈنسی ن پلے صاحب کو جو پمفلٹ کے مضمون کو پسند کرتے تھے۔ کہہ کر دس ہزار کاپیاں اور چھپوائیں۔ طلبا کو جنوبی افریقہ کے حالات جاننے کا اس قدر شوق تھا کہ یہ سب پمفلٹ تقسیم ہو گئے۔ مجھے اس وقت بڑی خوشی ہوئی اور میں نے دل میں کہا۔ کہ اگر ہندوستانی نوجوان اس قسم کا احساس رکھتے ہیں تو ان سے بہت کچھ اُمید کی جا سکتی ہے۔ تب سے طلبا کیساتھ میری دوستی بڑھتی ہی گئی ہے۔ اور ہمارے آپس کے تعلقات گہرے ہوتے گئے ہیں۔

میں نے بنگلور میں بھی کہا تھا۔ کہ جو زیادہ قربانی کرتے ہیں اُن سے زیادہ اُمید کی جاتی ہے۔ آپ نے اس قدر ایثار دکھلایا ہے تو مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں آپ سے بہت کچھ اُمید رکھوں۔ آپ جتنا بھی دیں گے میری تسلی نہ ہو گی۔ جو خدمت میں نے اب تک کی ہے آپ نے اس کی قدر شناسی کی ہے۔ آپ نے بڑے پیار اور عزت سے اپنے ایڈریس میں دار درنرائن کا ذکر کیا ہے۔ اور آپ کے پرنسپل صاحب نے بھی جو کچھ میں نے چرخے کے متعلق کہا ہے اُسکی خلوص دل سے تائید کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے بہت سے معزز اور لائق ہموطنوں نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ کہ یہ چھوٹا سا چرخہ جسے ہماری بہنوں اور ماتاؤں نے چھوڑ دیا ہے کبھی ہمیں سوراج دلا

۲۱

طلبا کا حصّہ

("ینگ انڈیا"- ۱۵ ستمبر ۱۹۲۷ء)

پچیاپہ کالج واقعہ تامل ناد میں طلبا کو خطاب کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا:-

دارِدرنرائن (مراد غریب لوگ) کے لئے جو دان آپ نے دیا ہے اُس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ مَیں اس ہال میں پہلی دفعہ نہیں آیا ہوں۔ ۱۸۹۶ء میں بھی مَیں یہاں آیا تھا۔ اور مَیں نے جنوبی افریقہ کی جدوجہد کے متعلق کچھ کہا تھا۔ ڈاکٹر سبرامانیہ آئر صاحب مرحوم اُس جلسے کے صدر تھے۔ اُس جلسے کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ اُس موقعہ پر مَیں پہلی دفعہ ہندوستانی طلبا سے ملا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مَیں نے صرف انٹرنس پاس کیا ہے اور کبھی کسی کالج میں داخل نہیں ہُوا۔ جب میری تقریر ختم ہو چکی اور شکریہ وغیرہ کی رسم بھی ادا ہو چکی تب مَیں طلبا کے پاس گیا جو میرا انتظار کر رہے تھے۔ میرے پاس سبز رنگ کا ایک پمفلٹ تھا جو مَیں اُن دنوں مُفت

پھر آپ کے لئے یہ بات سمجھنی بھی آسان ہوگی کہ اگر ہم سوائے کھدر کے اور کوئی چیز نہ پہنیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ غریبوں کی جیب میں کچھ پیسے جائیں گے جو اُنکی ضرورت کو پورا کریں گے۔ ذرا غور فرمایئے۔ مثلاً آپ اس کالج میں تقریباً ۱۴۰۰ طلبا ہیں۔ اگر آپ میں سے ہر ایک ہر روز آدھا گھنٹہ بھی چرخہ کاتے تو ملک کی دولت میں کسقدر اضافہ ہو جائے۔ اسی طرح اگر آپ سب ملکر اچھوتوں کے اُدھار (اصلاح) یا بہتری کے لئے کچھ کریں تو کتنا کام ہو جائے۔ اگر آپ چودہ سو کے چودہ سو یہ ارادہ کرلیں کہ ہم چھوٹی عمر کی شادیاں نہ ہونے دیں گے تو اندازہ لگایئے کہ کسقدر اصلاح ہو جائے گی۔ اسی طرح آپ میں سے ہر کوئی یا اکثر اگر اتوار کے دن یا فرصت کے وقت ایسی جگہوں پر جائیں جہاں لوگ شراب پیتے ہیں اور اُنکو سمجھاویں تو خیال فرمایئے آپ اپنے ہموطنوں کی اور اپنے ملک کی کسقدر خدمت کر سکیں گے۔

اگرچہ موجودہ طریقۂ تعلیم بالکل ناقص ہے پھر بھی آپ بہت کام کر سکتے ہیں اور ایسا کرنے میں کوئی زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑیگی صرف آپ کو اپنا دِل بدل دینا ہے یا سیاسی دنیا کی اصطلاح میں نقطۂ نظر کو تبدیل کر دینا ہے۔



جو میں کہتا ہوں وہ ٹھیک ہے اُسی وقت سے آپ کی اصلاح شروع ہو جانی چاہیئے اور چونکہ آپ میں سے اکثر ہندو ہیں آپ اس بات کی کوشش کیجیئے کہ آپ گیتا کے امرت بھرے سادہ اور خوبصورت اُپدیش کو اچھی طرح سے سمجھیں۔ ہم سب کا یہ تجربہ ہے اور میرے خیال میں کوئی منش نہیں جس کا یہ تجربہ نہ ہو۔ کہ جنہوں نے حقیقت کی تلاش کی ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اُن کے دل پاک و پوتر ہو جائیں اُنہیں یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ پرارتھنا کرنا ایک لازمی امر ہے۔ جو کچھ بھی کرو پرماتما پر بھروسہ کر کے کرو۔ میں دلیل سے تو آپ کو رضامند کر نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ بات دلیل کے دائرے سے باہر ہے۔ ہاں اگر عجز اور انکساری سے سوچو تو اننتے مہاپرشوں اور رشیوں کا تجربہ اور علاوہ بریں دنیا کے برگزیدہ منشوں کا کہنا کوئی وہم و گمان نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آگے چل کر جو کچھ میں کہنے والا ہوں صاف صاف سمجھ میں آجائے گا۔ اور مجھے بھی معلوم ہو جائے گا۔ کہ کس حد تک آپ حق کے متلاشی ہیں۔ اگر آپ کا ایشور پر وشواس پکا ہو تو اُسکی چھوٹی سے چھوٹی مخلوق کیساتھ آپ کی ہمدردی ہونی چاہیئے۔ پھر آپ کو یقین ہو جائے گا کہ چرخے یا کھدر کا سوال۔ اچھوتوں کا مسئلہ یا شراب کا بنانا اور پینا وغیرہ یا دیگر اصلاحات مثلاً چھوٹی عمر کی شادی یا بیوہ عورتوں کی شادی کا سوال دراصل ایک ہی سرچشمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

وہ برہم چاری ہے۔ یہ دیارتھی کا لفظ تو بعد میں گھڑا گیا ہے۔ اور ویسا پورا معنی نہیں جیسا کہ برہم چاری۔ آپ معنے تو جانتے ہی ہوں گے۔ اس کے لفظی معنے تو ہیں پرماتما کا متلاشی۔ یا وہ انسان جو تھوڑے سے وقت میں پرماتما کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہو۔ اور دنیا کے سب مذاہب اس بنیادی اصول پر متفق ہیں۔ کہ پرماتما کے پوتر دربار میں وہ مرد یا عورت حاضر ہو سکتا ہے جس کا دل صاف ہو۔ چاہے ہم کتنے بڑے عالم اور ویدوں کے جاننے والے کیوں نہ ہوں۔ یا ہم سنسکرت۔ لاطینی اور یونانی کیوں نہ جانتے ہوں یہ سب کچھ ہمارے کسی مصرف کا نہیں اگر ہمارا دل صاف نہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کا اصل مدعا تو چال چلن کی درستی ہے۔

شموگا میں میرے ایک انگریز دوست جنہیں میں پہلے نہ جانتا تھا۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں روحانیت کا بڑا بول بالا ہے۔ مگر طلبا کے دل میں تو ایشور کے جاننے کی کوئی خواہش دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ بہت سے طالب علم تو ایسے ہیں۔ کہ انکو یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ بھگوت گیتا بھی کوئی کتاب ہے۔ میں نے انہیں مناسب اور ٹھیک جواب دے دیا۔ مگر میں آپ لوگوں کو یہ نہیں بتلانا چاہتا۔ کہ میں نے اُن سے کیا کہا۔ آپ کا یہ نقص یا کمزوری قابلِ معافی نہیں ہے۔ میری پہلی درخواست آپ سے یہ ہے کہ سب سے پہلے آپ میں سے ہر ایک اپنے اندر کو ٹٹولے اور جہاں یہ معلوم ہو جائے کہ

اُن اُمنگوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اکثر طلبا کو روٹی کمانے کی فکر پڑ جاتی ہے یقیناً ایسی تعلیم میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہے۔ ایک بات تو ظاہر ہی ہے۔ جس کسی کا طلبا کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے وہ تو خوب جانتا ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم ناقص ہے۔ ایک تو ملک کی ضروریات کے مطابق نہیں۔ ہمارا ملک بہت غریب ہے۔ دوسرے ہمارے گھر کی زندگی اور گاؤں کی زندگی میں اور اس سلسلۂ تعلیم میں کوئی مطابقت معلوم نہیں ہوتی۔ مگر یہ ایک ایسا وسیع اور جامع سوال ہے کہ شاید اس قسم کے جلسے میں اس پر کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا۔

موجودہ حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں تو یہ سوچنا ہے کہ طلبا کیا کچھ کر سکتے ہیں اور ہم بھی ملک کی کس طرح سے مزید خدمت کر سکتے ہیں۔ جو لوگ طلبا میں دلچسپی لیتے ہیں اور اُنکی بہتری کے خواہاں ہیں وہ تو یہی کہیں گے کہ طلبا کو اپنے اندر کو دیکھنا چاہیئے اور اپنے چال چلن کو مضبوط بنانا چاہیئے۔ صحیح تعلیم وہی ہے جو ہمیں پاکیزہ بناتی ہے۔ مجھے ہزاروں طالب علموں سے ملنے کا موقعہ ملتا ہے اور بیشمار خط بھی اُنکے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں وہ اپنے دلوں کا حال کھول کر لکھ دیتے ہیں اور پوری کیفیت بیان کر دیتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبا کو ابھی کافی راستہ طے کرنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد کیا ہے۔ ہماری زبان میں تو طالب علم یا ودیارتھی کے لئے ایک نہایت ہی خوبصورت لفظ ہے اور

۲۰

طالب علم کیا کچھ کر سکتے ہیں؟

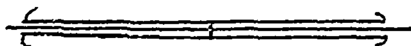
(ینگ انڈیا - ۸ر دسمبر ۱۹۲۷ء)

ولور میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا:-

"مجھے یہ دیکھ کر نہایت خوشی اور بڑی تسکین ہوئی ہے کہ باوجود بہت سی مشکلات کے بھی ہندوستان کے طالب علم مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ اُنہوں نے بہت حد تک میرے کام کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ باوجود اس قدر محبت کے اظہار کے بھی اور غریبوں کا ساتھ دینے کی بھی طلبا کو ابھی اور منزلیں طے کرنی ہیں۔ آپکے ساتھ قوم کی آئندہ امیدیں وابستہ ہیں۔ جب آپ سکول اور کالج چھوڑ دینگے تو آپ کو قوم کی خدمت کرنی ہوگی۔ اور غریب ہموطنوں کی رہنمائی کرنی ہوگی۔ آپکو ابھی سے اپنی ذمہ واری کا احساس ہونا چاہیئے۔ اور یہ ذمہ واری عملی شکل میں ظاہر ہونی چاہیئے۔ یہ ایک عجیب بات ہے اور قابلِ افسوس بھی ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں تو طلبا اپنے سینے میں ہزار اُمنگیں لئے ہوتے ہیں۔ مگر جب پڑھائی ختم کر چکتے ہیں تب

آپ سے کہنا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ ایک عالم شخص نے گیتا کا مفصلہ ذیل شلوک چرخے پر خوب گھٹایا ہے۔

"دھرم پر تھوڑا سا عمل بھی انسان کو کئی آفتوں سے بچاتا ہے۔ اس میں نہ تو محنت ضائع ہوتی ہے۔ نہ ہی دھرم پالن میں کوئی رکاوٹ حائل ہو سکتی ہے"



گائتری بھی ویسی نتیجہ خیز نہیں۔ گائتری منتر پڑھ لیے شک اچھا ہے۔ مگر چرخہ چلانے چاہئے۔ اور ایشور کا نام لینے چاہیئے۔ اچھا نتیجہ نکلے گا۔

ایک انگریز دوست نے مجھے لکھا کہ عقل تو یہ کہتی ہے کہ چرخہ چلانا ایک اچھی تفریح ہے۔ ہمارے لیئے تو دولت کا درخت ہے۔ میں مغربی طریقوں کو بہت پسند تو نہیں کرتا۔ مگر بعض باتیں مغربی لوگوں میں ایسی بھی ہیں جو قابل تعریف ہیں مثلاً اُنکی تفریح کے متعلق مختلف طریقے۔ کرنل میڈک صاحب جو ایک بڑے لائق ڈاکٹر تھے۔ اور بڑا کام کیا کرتے تھے۔ مگر پھر بھی روز دو گھنٹے باغیچہ میں جاکر مالی کا کام کیا کرتے تھے۔ اور اس میں بڑا حظ اُٹھایا کرتے تھے۔ میں بھی آپ کو چرخہ پیش کرتا ہوں۔ اِسے تفریح کے طور پر کات لیا کیجئے۔ تاکہ آپ بھی جینے کا مزہ لیں۔ اور آپ کو بھی شانتی اور خوشی میسر ہو۔ آپ کے برہمچاری رہنے میں چرخہ مدد دے گا۔ طالب علمی کے زمانہ میں مضبوط نتیجہ ہونا بڑا اچھا ہوتا ہے۔ آپ بہت سی باتیں ویسے ہی مان لیا کرتے ہیں۔ کیونکہ اُستاد ایسا کہتے ہیں۔ اقلیدس کی بعض شکلیں میری سمجھ میں بالکل نہ آتی تھیں۔ مگر اب وہ میری سمجھ میں آ گئی ہیں اور میں اُن کے حل کرنے میں بڑا لطف اُٹھاتا ہوں۔ اور وہ لُطف ویسا ہی ہے جیسا کسی اور کام میں۔ اگر آپ میری بات مانیں اور چرخہ چلانے لگیں تو کسی دن آپ کو یقین ہو جائے گا۔ کہ جو کچھ مَیں

تھے۔ اور پھر نفرت کرنے لگے اور اب تو چرخے کی بڑی قدر ہو گئی ہے اب تو کانگرس بھی چرخے کی حامی ہے۔ اور میں بڑے ادب سے چرخے کو وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی نذر کرنے والا ہوں۔ اور یہ میں بلا تامل کر دوں گا۔ کیونکہ مجھے کیا نقصان ہوگا؟ نقصان تو وائسرائے صاحب کو ہوگا جو نسخہ منظور نہ کرینگے۔ میں نے تو کلکتہ کے لاٹ پادری کو بھی چرخے کا پیغام دے دیا تھا۔ میں اُن سے دہلی میں ملا تھا۔ میں نے یہ پیغام کرنل میڈک صاحب کو بھی دیا تھا۔ اور جب اُنکی بیوی صاحبہ انگلستان روانہ ہوئیں۔ تو میں نے اُنہیں ایک کھدر کا تولیہ نذر کیا اور اُن سے کہا کہ وہ اس پیغام کو ہر گھر میں پہنچا دیں۔

چرخے کا سندیسہ تو میں ہمیشہ ہی اور ہر وقت دیتا رہتا ہوں۔ ہے تو یہ بات معمولی سی مگر اس سے فائدہ بہت ہے۔ ہے تو کچھ بدمزہ سی بات مگر بے مصالحہ کی خوراک ہی صحت کے لئے اچھی ہوتی ہے۔ گیتا کے ایک مشہور شلوک میں شری کرشن جی فرماتے ہیں۔ کہ سمجھدار لوگ ایسی چیزیں کھاتے پیتے ہیں جو پہلے تو کڑوی معلوم ہوتی ہیں مگر اُن کا پھل امرت جیسا میٹھا ہوا کرتا ہے۔ آجکل چرخہ وہ چیز ہے اور اُسکی پیدائش یعنی کھدر بمنزلہ امرت ہے۔ چرخہ کاتنا گویا ایک یگیہ یعنے قربانی کرنا ہے۔ اس سے لوگوں کو سکھ ملے گا۔ اور طلیکے آزردہ دلوں کو شانتی ملے گی اور وہ روحانی بن جائیں گے۔ میرے پاس تو موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ملک کے لئے اس سے بہتر نسخہ نہیں ہے۔

ناولوں کے نزدیک بھی نہیں جاتا تھا۔ سو اگر میں نے یہ ناول نہ پڑھے تو مجھے کیا نقصان رہا۔ اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جن سے طلبا کا بچنا مشکل ہے۔ مثلاً یہ کہ ہر ایک طالب علم بڑا عہدہ دار ہی بنے اور امیر ہو جائے۔ ان باتوں کا خیال تو ایک گرہستی کو ہونا چاہیئے طالب علموں کو اس کا کیوں فکر ہو۔ انہیں تو چاہیئے۔ کہ وہ اپنے ملک کی حالت سے پورے واقف ہوں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو کہ حالات خطرناک تو نہیں۔ اور اگر ہیں تو انہیں کیا کرنا چاہیئے؟ آپ میں سے اکثر اخبارات کا مطالعہ تو کرتے رہتے ہوں گے۔ اخباروں میں بہت سے ایسے مذاکرات ہوتے ہیں جنکے پڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اور سچ پوچھو تو مطلب کی باتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اُنکے پڑھنے سے کوئی چالچلن کی درستی نہیں ہو سکتی۔ مگر لوگ انکو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں کیسی افسوسناک بات ہے۔ میں یہ سب باتیں آپ سے کہہ رہا ہوں کیونکہ یہ سب کچھ میرے تجربے میں آیا ہے۔ ایسے تجربے کرتے کرتے مجھ پر سلسلہ تعلیم کی حقیقت کھل گئی ہے۔ میں نے ستیہ آگرہ اور عدم تشدد جیسے تجربے شروع کر دیئے۔ مجھے یہ تجربات شروع کرنے کے بعد کوئی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اور میں نے اُنکو اس واسطے شروع نہیں کیا۔ کہ ہمیں سیاسی سوراج مل جائے۔ بلکہ میں نے تو طلبا کو بھی ایسا کرنے کی صلاح دی ہے۔ طالب علم بالکل سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ اُنکا وہی چرخے سا حال ہے۔ پہلے لوگ چرخے پر ہنسا کرتے

کرنا ٹھہرا۔ اُنہیں چاہیئے کہ وہ اچھی باتوں کو گرہن کر لیں اور بُری باتوں کو چھوڑ دیں۔ اُستاد کا بھی فرض ہے کہ اُنہیں اچھے بُرے میں تمیز کرنا سکھلا دے۔ اگر بغیر سوچے سمجھے اپنے اندر سب کچھ ڈالتے جائیں تو ہم تو ایک مشین یا کل کی طرح ہوئے۔ مگر ہم تو انسان ہیں اور سوچ سمجھ سکتے ہیں۔ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کی عقل رکھتے ہیں۔ کون سی باتیں میٹھی ہیں اور کونسی کڑوی۔ پاک اور ناپاک میں کیا فرق ہے۔ طلبا کا آج کل صرف یہی کام نہیں۔ اس سے بھی زیادہ مشکل اُن کے لئے اپنے ماحول سے لڑنا ہے پچھلے زمانوں میں تو اُنہیں اپنے اُستادوں کے ساتھ آشرموں میں رہنا ہوتا تھا اور والدین بھی اُنکی حفاظت کیا کرتے تھے۔ فی زمانہ نہ ہی پریوار اچھے ہیں۔ اور موجودہ طریقۂ تعلیم نے ایک بناوٹی سا ماحول بنا دیا ہے جس میں طلبا کو زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ پرانے گورو یا اُستاد بغیر کتابوں کی مدد کے سب کچھ سکھلا دیا کرتے تھے۔ طالب علم کچھ منتر سیکھ کر اُنہیں یاد کر لیا کرتے تھے اور بس۔ یہی تعلیم عمل میں بھی لے آتے تھے۔ آجکل تو طلبا کے پاس کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ اور وہ اُن کے بوجھ سے ہی دبے رہتے ہیں۔ میرے وقتوں میں طلبا رینالڈ کے ناول بہت پڑھا کرتے تھے اور میں بچ گیا۔ کیونکہ میں ہوشیار لڑکوں میں سے نہ تھا اور سکول کی کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھتا تھا۔ جب میں انگلستان گیا تو میں نے دیکھا۔ کہ کوئی شائستہ شخص ایسے خراب

طلبا کو اس تعلیم کے عوض میں کچھ دینا نہیں پڑتا تھا۔ ہاں جب وقت آتا تو وہ اس قرضے کو اپنے سر پر سے اُتار دیتے تھے۔ بلکہ اصل کے ساتھ سود در سود بھی دیتے تھے۔ اسی لئے ہندو کہتے ہیں کہ برہمچریہ آشرم کا پالنا دھرم ہے۔

برہم چاری اور سنیاسی کی زندگی روحانی لحاظ سے ایک ہی طرح کی ہے۔ برہم چاری کی زندگی دراصل ایک سنیاسی یا تیاگی کی زندگی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ سنیاسی اپنی مرضی سے برہم چاری بن جاتا ہے۔ ہندوؤں کے چار آشرم یعنی زندگی کی منزلیں اب صرف نام کی ہی رہ گئی ہیں۔ اُن میں تقدس نہیں رہا۔ برہمچاریوں یعنی طلبا کی زندگی تو شروع ہی میں بگڑ جاتی ہے۔ اگرچہ آشرم دھرم میں موجودہ نسلوں کے لئے سیکھنے یا نقل کرنے کے لئے کچھ نہیں رہا۔ پھر بھی آشرم دھرم کا آدرش (نمونہ) بہت ہی قابل قدر ہے۔ بھلا موجودہ زمانہ میں جب ہم آدرش سے گر گئے ہیں تو طلبا کے فرض کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اول تو والدین ہی بچوں کو غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ ایسا خیال کرتے ہیں کہ پڑھنے کی غرض و غایت یہی ہے کہ بچوں کو دولت اور ملازمت ملے۔ تعلیم اور علم کی تو یہ دُردشا ہو رہی ہے تو طلبا کی زندگی میں کس طرح صلح یا امن یا خوشی آسکتی ہے؟ بچارے طالب علموں کے سروں پر تو رنج و الم کا بوجھ رکھا رہتا ہے۔ اُنکو کیسے بیفکری حاصل ہو سکتی ہے؟ اُن کا کام تو علم سیکھنا اور سیکھ کر یاد

۱۹

طلبا کا فرض

(ینگ انڈیا - ۲۹ر جنوری ۱۹۲۵ء)

سابل داس کالج واقع بھونگر میں گاندھی جی نے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

" مجھے آج طلبا کے دہرم یعنی اُن کے فرض کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ وہ فرض آسان بھی ہے اور مشکل بھی ہے۔ ہندو دھرم کے مطابق طالب علم ایک برہمچاری کہلاتا ہے۔ جب تک تعلیم حاصل کرتا ہے تب تک برہمچاری ہی رہتا ہے۔ برہمچاری ہونے کے یہ معنی نہیں کہ انسان مجرّد ہی رہے اور شادی نہ کرے۔ برہمچاری کے اصلی معنی ودّیارتھی یعنی طالب علم کے ہیں۔ برہمچریہ کے معنے نفس کو قابو میں رکھنے کے ہیں۔ اسی وجہ سے طالب علمی کے زمانے کو برہمچریہ آشرم کا نام دیا گیا ہے۔ اس زمانے میں نوجوانوں کو بہت کچھ سیکھنا ہوتا ہے۔ دوسروں کو سکھلانا نہیں ہوتا۔ نوجوان والدین سے۔ اُستادوں سے اور ماحول سے بہت کچھ اپنے اندر لیتے رہتے ہیں۔ پُرانے وقتوں میں

عورتوں کی روحانی پیاس کو بجھانے کی بجائے اُن کے جذبات کو اُبھارتے ہیں۔ بعض بچاری غریب عورتیں جیسا ناول اُن کا نقشہ اُتارتے ہیں ویسا ہی بن کر دکھلانے میں اپنا وقت ضائع کرتی ہیں۔ مجھے تو حیرانی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں۔ کہ کتابوں میں اُن کی جسمانی شکل و شباہت وغیرہ بیان کرنے میں صفحے کے صفحے بھر دیئے جاتے ہیں بھلا اس سے کیا فائدہ۔ کیا اُپنشدوں میں یا انجیل میں یا قرآن میں بھی آپ ایسی باتیں پاتے ہیں؟ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انجیل انگریزی زبان میں ایک لاثانی کتاب ہے۔ تین چوتھائی انگریزی زبان انجیل میں ہے اور باقی ایک چوتھائی شکسپیئر میں ہے۔ اگر قرآن نہ ہو تو عربی زبان کا کیا باقی رہ جائے۔ اسی طرح ہندی زبان بغیر تلسی داس کے بیکار ہے۔ اُن کتابوں میں عورتوں کے متعلق کوئی ناموزوں باتیں نہیں پائی جاتیں۔



وہ کہتی ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ اس قدر کم ہمت کہا جاتا ہے اور ہم سے گھر کا کام لیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ ہم خاوندوں کی پرستش کرتی ہیں۔ ان بیانات میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ نہ تو ہم ایسی پریاں ہی ہیں اور نہ ہی مردوں کے لئے گڑیا۔ اور نہ ہی جذبات کا مجموعہ۔ ہم بھی مردوں کی طرح انسان ہیں۔ ہم بھی آزادی کو ویسا ہی پیار کرتی ہیں جیسا کہ مرد۔

میں اُن کے جذبات اور احساسات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جب میں جنوبی افریقہ میں رہا کرتا تھا تو بہت سی عورتیں مجھے ملنے آیا کرتی تھیں۔ اُن کے مرد جیل میں قید تھے۔ اُن کی تعداد کوئی ساٹھ کے قریب ہوگی۔ اور وہ سب مجھے اپنے والد یا برادر کی طرح جانتی تھیں۔ میرے زیر اثر وہ بڑی دلیر اور دلاور بن گئیں۔ یہاں تک کہ جب اُن عورتوں کو جیل جانا پڑا۔ تو وہ خوشی سے گئیں۔

لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری کتابوں میں عورتوں کی بے حد تعریف کی جاتی ہے۔ یہ تعریف بالکل ناواجب ہے۔ ایک سادہ معیار آپکو بتلاتا ہوں۔ جب آپ عورتوں کے متعلق کچھ لکھیں تو ایسا سمجھئے کہ آپ اپنی ماتا کے متعلق کچھ لکھ رہے ہیں تب آپ کے بیانات اُن کے متعلق بالکل پوتر اور پاک ہونگے۔ اور ایسا سماں بندھ جائے گا۔ کہ جیسے برکھا کے وقت ہوتا ہے۔ خشک زمین پانی سے سیراب ہو جاتی ہے۔ عورت بیوی بننے سے پہلے ماں ہوُا کرتی ہے۔ بہت سے مصنّف

ہی نہیں۔ اگر اس طرف توجہ دی جائے تو موقعہ بڑا اچھا ہے۔ اہلِ زبان اور اہلِ علم کو اسطرف قدم اُٹھانا چاہیئے۔ اُنہیں گاؤں میں جاکر وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اُن لوگوں کی ضرورت کے مطابق اُنہیں کتابیں دینی چاہیئں۔

ہم نے واردھا میں دیہاتیوں کے اندر کام کرنے والوں کے لئے ایک درسگاہ قائم کی ہے۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا تھا۔ کہ اگر اُنہیں دیہات کی دستکاریوں کے متعلق کوئی اچھی کتاب لکھنی منظور ہو تو اُنکو چاہیئے۔ کہ اُن دستکاریوں کو پہلے خود سیکھیں۔ یہ نہ کہیئے۔ کہ اگر ہم گاؤں میں جاکر رہیں گے تو وہاں کا ماحول ہم پر اثر کریگا اور ہماری دماغی قابلیت جاتی رہے گی۔ میرے خیال میں اس کے اُلٹ ہوگا۔ گاؤں کی ہوا سے آپ کے دماغ تر و تازہ ہو جائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ آپ آنکھیں اور کان کھول کر وہاں جایئے۔ جیوتی سنگ ایک عورتوں کی تحریک ہے۔ اس میں ایک پرستاو (قرارداد) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس میں عورتوں نے ہی اس بات کی شکائت کی تھی کہ فی زمانہ کتابوں میں اُنکے متعلق ناشائستہ الفاظ لکھے جاتے ہیں۔ گاندھی جی نے ضمناً کہا۔ کہ یہ شکائت بجا ہے اور عورتوں کا یہ کہنا کہ آج کل کے اہلِ قلم اُن کے متعلق غلط بیانی کرتے ہیں درست معلوم ہوتا ہے۔ جس طریقے سے اُن کے احساسات کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور جسطرح اُن کے جسم کے متعلق لکھا جاتا ہے عورتیں اُسکو پسند نہیں کرتی ہیں

چاہتا ہوں کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ میں سیاروں کے علم سے بالکل بے خبر تھا۔ جب میں بیداداجیل میں تھا۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ ہر رات کو کا لیکر آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی ستاروں کو دیکھنے کا شوق ہوا۔ میں نے کچھ کتابیں منگوالیں اور ایک دُوربین بھی لے لی۔ انگریزی میں تو اس علم پر بے شمار کُتب تھیں۔ مگر گجراتی زبان میں ایک بھی نہ تھی۔ کسی نے مجھے ایک چھوٹی سی کتاب بھیجی۔ مگر وہ بالکل نکمی تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم دیہات کے رہنے والوں کو اس علم کے متعلق اُنکی اپنی زبان میں کتابیں مہیا نہ کریں۔ مگر ہمارے پاس تو جغرافیے کی بھی اچھی کتابیں گجراتی میں نہیں ہیں۔ کم از کم مجھے تو کوئی دکھائی نہیں پڑتی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم نے گاؤں کے رہنے والوں کیطرف بالکل دھیان ہی نہیں دیا۔ وہ لوگ تو ہمارے لئے کھانے پینے کا سامان تیار کرتے ہیں۔ اور ہم ایسا خیال کرتے ہیں کہ ہم مالک ہیں اور وہ غلام۔ ہم نے اُنکی ضروریات کی پرواہ تک نہیں کی۔ یہ بات صرف ہمارے ملک کا ہی حصہ ہے کہ یہاں ہر چیز انگریزی زبان میں سکھائی جاتی ہے۔ اور یہ نہایت افسوسناک حالت ہے۔ جب ہم میں کوئی جان نہیں تو ہماری زبان میں کیا جان ہو سکتی ہے؟ فرانسیسی اور آلمانی زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں وہ فوراً انگریزی میں ترجمہ ہو جاتی ہیں۔ بلکہ خود انگریزی ادبیات اختصار شدہ شکل میں عمدہ اور سستی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی انتظام

کی بہتات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کہ ذرا غور فرمایئے۔ کہ ایک شلنگ والے ناول کس کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں۔ کہ اگر گجراتی زبان میں اس قسم کے ناول یا دیگر کتابیں نہ ہوئیں تو نہ سہی۔ ہماری زبان کا کیا گھٹ جائے گا۔ بلکہ جتنے ناول کم ہوں اُتنا ہی اچھا ہے۔ چالیس برس کا عرصہ ہوا۔ کہ میں جنوبی افریقہ گیا تھا۔ میرے پاس اس وقت کچھ کتابیں تھیں۔ جن میں سے ایک ٹیلر کی صرف و نحو یعنی گرامر بھی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے۔ کہ وہ کتاب مجھے بہت پسند تھی۔ مگر تب سے لیکر آج تک میں نے اُسے دوبارہ نہیں پڑھا۔ جس دن مجھے صدارت کرنی تھی میں نے یہ کتاب لائبریری سے نکالی مگر میں نے صرف تمہید کے چند فقرے پڑھے کہ جن میں مجھے کچھ فقرے بہت ہی اچھے لگے۔ مصنف مسٹر ٹیلر بڑے زور سے لکھتا ہے۔ "کون کہتا ہے کہ گجراتی ایک معمولی سی زبان ہے؟ بھلا سنسکرت زبان سے نکلی ہوئی کوئی زبان کمزور ہو سکتی ہے؟ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔" زبان کی خوبی اُس زبان کے بولنے والوں پر ہوا کرتی ہے۔ کوئی زبان دراصل کمزور نہیں ہوا کرتی۔ اُس زبان کے بولنے والے نہ کمزور ہونے چاہئیں۔ اگر فرض کیا جائے۔ کہ کچھ ناول گجراتی میں بھی ہوں تو کیا زبان طاقتور ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ مثلاً اگر چند ایک مذاہب لیسی جیسے ناول گجراتی میں ہوں بھی تو کیا فائدہ؟

مجھے پھر دیہات کے سوال کو لینے دیجیئے۔ میں آپ کو بتلا دینا

کی عورتیں جو میرے سامنے بیٹھی ہیں بھلا وہ کیا جانیں کہ سیگاؤں کی عورتیں کیسی ہیں۔ وہاں کی عورتیں کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتیں۔ وہ تو میرے ساتھ گیت (رام دھن) بھی نہیں گا سکتیں۔ سارا دن بچاری گھر کے کام کاج میں لگی رہتی ہیں۔ دھوپ ہو یا بارش دن بھر پانی بھرتی رہتی ہیں۔ نہ اُنکو بچھو کا ڈر نہ سانپ کا۔ وہ گھاس کاٹتی ہیں۔ لکڑیاں پھاڑتی ہیں۔ اور اگر میں کبھی اُنہیں پیسہ یا کام دوں تو مجھے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ان بچاری غریب بہنوں کو میں کیا دوں؟ وہ لوگ تو احمد آباد میں نہیں رہتے۔ اُنکے گھر گاؤں میں ہیں۔ ویسے تو میں جانتا ہوں۔ کہ اُنکو کیا دینا چاہیئے۔ میں آپ سے نہیں کہنا چاہتا۔ میں کوئی بڑا مقرر نہیں ہوں۔ نہ ہی کوئی بڑا صاحب قلم ہوں۔ میں تو مجبوراً کچھ لکھ لیتا ہوں۔ ایک وقت تھا۔ کہ میں بولتا بھی کم تھا۔ بلکہ میرے دوست کہا کرتے تھے۔ کہ میں بالکل سادہ مزاج ہوں۔ بلکہ جب کبھی میں عدالت میں پیش ہوتا تو میں مشکل سے چار لفظ بول سکتا تھا۔ تقریریں کرنا یا کتابیں لکھنا میرا کام نہیں ہے۔ میرا کام تو لوگوں میں رہ کر اُن کو صحیح طریق سے زندگی گذارنا بتلانا ہے۔ سوراج کی چابی شہر کے رہنے والوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بلکہ گاؤں کے لوگوں کے پاس ہے۔ اسی لئے میں گاؤں میں آبسا ہوں۔ یہ گاؤں جس میں میں اب رہتا ہوں۔ میں نے ویسے ہی چن لیا ہے۔ کچھ ایسا موقعہ ہی بن گیا۔

کانفرنس کے ختم ہونے والے دن گاندھی جی نے انگریزی کتابوں

میں نے ایک پرانے مندر میں ایک چھوٹا سا مجسمہ دیکھا۔ جو ایک دریچے میں رکھا ہوا تھا۔ مجسمہ کیا تھا ایک بولتی ہوئی تصویر تھی۔ میں بغیر کسی کے بتلائے ہوئے سمجھ گیا۔ کہ وہ کیا چیز ہے۔ یہ مجسمہ ایک عورت تھی۔ آدھی ننگی تھی اور کپڑا سنبھال رہی تھی۔ ادھر سے کام دیوتا اپنے تیر چلا رہا تھا۔ آخر وہ کامیاب نہ ہوا۔ اور بچھو کی شکل میں ہار مان کر اُس عورت کے پاؤں میں آن گرا۔ کم از کم مجھے وہ مجسمہ دیکھ کر ایسا احساس ہوا۔ روی شنکر صاحب کچھ اور معنی نکالیں تو وہ بات دوسری ہے۔

اپنے مطلب کو آپ کے ذہن نشین کرانے کے لئے میں تو گھنٹوں بول سکتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ علوم و فنون ایسے ہونے چاہئیں جو عام فہم اور آسان ہوں۔ سب کوئی اُنکو سمجھ سکے۔ میں نے مختصر طور پر یہ کچھ کہہ دیا ہے۔ تفصیلات آپ سمجھ لیجئے۔ میں نے جو کچھ عرض کرنا تھا کر دیا ہے۔ میرا دل آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے۔ عجب تو یہ ہے کہ غم کے مارے دل پارہ پارہ نہیں ہو جاتا! جب سیگاؤں کے بھوک سے مرتے ہوئے (یہاں پر گاندھی جی کے آنسو نکل آئے اور وہ چپ سے ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پھر بولے) پنجر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں تو میں کہتا ہوں۔ کہ کیا ہمارا ساہتیہ (علم و ادب) یہی ہے۔ پرنسپل آنند شنکر دھرو صاحب نے مجھے ایک سو کتابوں کی فہرست بھیجی۔ مگر اُن میں سے ایک کتاب بھی سیگاؤں کے لوگوں کے کام کی نہ تھی۔ اُنکو کونسی کتابیں دوں؟ اور اُنکی عورتوں کو کونسی کتابیں دوں؟ احمد آباد

عجز اور انکساری سے لکھا۔ اس کتاب کی زبان بھی آسان ہے۔ اور ہر
کوئی سمجھ سکتا ہے۔ یوں سمجھو جیسے ڈکنس نے لکھی ہو۔ اگر ڈاکٹر جانسن
لکھتے تو مشکل الفاظ استعمال کرتے۔ کیا ہمارے ہاں بھی غبر ر جیسے
مصنف ہیں۔ جو گاؤں کے لوگوں کے لئے آسان کتابیں لکھیں؟ ہمارے
پڑھے لکھے لوگ کالیداس اور بھوبھوتی اور دیگر انگریزی مصنفین کی
طرف مائل ہوں گے۔ اور اُنکی نقل اتاریں گے۔ میرے خیال میں
ہمیں گاؤں میں جاکر اُن لوگوں کے مذاق کے مطابق اُنہیں زندگی
بخشنے والی کتابیں دینی چاہئیں۔

نمائش کے متعلق بھی گاندھی جی نے کہا:۔
آج صبح میں نے نمائش دیکھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اور مجھے اس
بات کا فخر ہے کہ پہلے کبھی اس قسم کی نمائش صوبہ گجرات میں نہیں ہوئی
مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ کہ نمائش گاہ میں تصویریں اچھی
نہیں۔ تصویر وہ ہوتی ہے جو جادو کی طرح سر پر چڑھ کر بولے۔ بنانے
والا اس کے متعلق کچھ نہ کہے۔ میں اپنے مطلب کو ذرا واضح کر دوں۔ روما
میں پوپ کے محل میں میں نے کچھ مجسمے دیکھے۔ اُن میں سے ایک مجسمہ
حضرت مسیح کو سولی پر لٹکے ہوئے دکھلاتا ہے۔ اُس کو دیکھ کر میں ششدر
رہ گیا آج سے پانچ سال پہلے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ مگر ابھی تک
وہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اُس کی خوبصورتی بیان کرنے والا
وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اسی طرح بلور میں جو میسور ریاست میں ہے

مگر بیچارے دیہاتی کیا سمجھیں۔ مثلاً اُن بیچاروں کو سپانیہ اور روس کی کیا خبر۔ وہ جغرافیہ کا ایک حرف نہیں جانتے۔ اُنکو پڑھ کر کیا سنایا جائے۔ منشی کے ناول یا کرشن چندر جو کرشن لال جاویری جی نے بنگالی سے ترجمہ کئے ہیں؛ یہ کتابیں تو اچھی ہیں مگر ان پڑھ لوگ بیچارے ان کتابوں کو کیا کریں؟ اُنہیں تو ایسی کتابیں سمجھنے کے لئے وقت چاہیئے میں سیگاؤں سے ایک لڑکا اپنے ساتھ لا سکتا تھا۔ مگر وہ یہاں آ کر کیا کرتا۔ اس کے لئے تو یہ جگہ عجیب سی تھی۔ مگر میں ایسے لوگوں کی نمائندگی کرنے کے لئے یہاں حاضر ہوا ہوں۔ یہ ہے اصلی جمہوریت آپ میں سے کوئی میرے ساتھ سیگاؤں چلے۔ میں آپ لوگوں کے لئے راستہ صاف کر رہا ہوں۔ ہے تو یہ کام مشکل۔ مگر جہاں کانٹے ہوتے ہیں وہاں پھول بھی ہوتے ہیں۔

ابھی مجھے یاد آیا ہے کہ پادری فیبرز نے حضرت مسیح کی زندگی پر ایک کتاب لکھی ہے۔ میں برطانیہ حکومت کیساتھ جی کھول کر لڑ لیتا ہوں۔ مگر انگریزوں اور اُنکی زبان سے مجھے کوئی دشمنی نہیں۔ بلکہ مجھے اُنکے ادبیات سے بڑی محبت ہے۔ اور پادری صاحب کی کتاب نہایت ہی عمدہ ہے۔ اُنہوں نے یہ کتاب لکھنے میں بڑی محنت کی ہے مسیح کی زندگی کے متعلق ہر ایک چیز کو پڑھا اور پھر فلسطین تشریف لے گئے اور ہر مقام اور موقعہ کو دیکھا جنکا بائیبل میں ذکر آتا تھا۔ اور چھان بین کرنے کے بعد اس کتاب کو انگلستان کے عوام کے لئے بڑی

گیت تیار کریں جنکو بیل ہانکتے ہوئے اور کنوئیں سے پانی نکالتے ہوئے ہمارے کسان گایا کریں۔ تاکہ وہ اپنی زبان گالیوں سے گندی نہ کریں۔ اُس وقت ہمارے سنبیاگرہ آشرم کے نزدیک ایک گاؤں کوشرب میں نرسنگ راؤجی رہا کرتے تھے۔ گاؤں کیا تھا احمد آباد کے نزدیک مزدوروں کی بستی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کیلئے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اُن کے لئے کار آمد ہوں سوال یہ ہے۔ کہ کیا کیا جائے؟ میں اب سیگاؤں میں رہتا ہوں۔ آبادی چھ سو کے قریب ہوگی۔ صرف دس آدمی پڑھ لکھ سکتے ہوں گے شائد پچاس ہوں مگر اس سے زیادہ نہیں۔ ان میں سے تین چار ایسے ہونگے جو پڑھ کر سمجھ سکتے ہوں۔ کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ عورتوں میں سے تو ایک بھی پڑھ لکھ نہیں سکتی۔ اس گاؤں میں ۳/۴ یا ۵ ۷ فیصدی ہریجن یعنی اچھوت ہیں۔ میں نے اُن کے لئے ایک لائبریری قائم کرنیکا ارادہ کیا۔ اس لائبریری میں وہ کتابیں رکھی تھیں جن کو وہاں کے لوگ پڑھ سکیں۔ میں نے دو تین سکول کی لڑکیوں سے ایک درجن کتابیں مانگ لیں جو اُنکے کام کی نہ تھیں۔ میرے پاس ایک نوجوان ٹھہرا ہوا تھا جس نے وکالت پاس کی تھی۔ اور جس کو قانون وغیرہ سب بھول گیا تھا۔ اور جو میرے ساتھ ہی کام کرتا تھا وہ نوجوان گاؤں میں جاتا ہے اور اُن کتابوں میں سے جہاں تک وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں پڑھاتا ہے۔ ایک دو اخبار بھی ساتھ لیجاتا ہے۔

۱۸

میں کس قسم کی کتابوں کا خواہشمند ہوں؟

("ہریجن" - ۱۴ نومبر ۱۹۳۶ء)

احمد آباد میں گجراتی ادبیات (ساہتیہ) کی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے گاندھی جی نے فرمایا:۔

کتابوں کی کن کو ضرورت ہے؟ احمد آباد کے شرفا کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو پڑھے لکھے لوگوں کو ملازم بھی رکھ سکتے ہیں۔ اور کتابیں بھی خرید سکتے ہیں۔ مگر وہ غریب آدمی جو کنوئیں سے بیلوں کی مدد سے پانی نکال رہا ہے وہ بیچارا کیا کرے؟ کچھ عرصہ ہؤا میں نے نرسنگ راؤ جی سے کہا تھا (افسوس ہے کہ وہ بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے آج یہاں حاضر نہیں ہو سکے) کہ وہ کچھ ایسے

اعتراض کرنے والے اِن دو باتوں پر متفق ہیں۔ یعنی ایک تو تعلیم مادری زبانوں میں ہونی چاہیئے۔ اور دوسرے اصلی معنوں میں یعنی قومیت کا خیال رکھ کر تعلیم دی جائے۔ مگر اُن کا متفق ہونا مجھے مطمئن نہیں کرتا۔ وُہ نکتہ چینی تو ضرور کرتے ہیں مگر موجودہ طریقۂ تعلیم کو بدلنے کے لئے تیار نہیں۔ اب جب اِصلاح کرنے کا موقع ملا ہے تو کانگرسیوں کو بے صبر ہونا چاہیئے۔ اور جلدی کرنی چاہیئے۔ اگر انگریزی زبان میں تعلیم دینا فوراً ہی بند کر دیا جائے اور دیر نہ کی جائے تو تھوڑے عرصے میں ہی کتابیں تیار ہو جائینگی۔ اور اگر ہم ذرا تکلیف اُٹھائیں تو ایک سال کے اندر اندر ہی ہمیں معلوم ہو جائے کہ اگر یہ بات تھی تو ہم کیوں اپنی قوم کا وقت اور روپیہ ایک غیر مُلک کا تمدّن سیکھنے میں اب تک ضائع کرتے رہے۔ کامیاب ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ حکومت کی عدالتوں اور دفتروں میں صوبوں کی زبان فوراً ہی جاری کر دی جائے۔ جہاں حکومت کو اختیارات حاصل ہیں وہاں تو یہ حکم دینا آسان ہے۔ اگر اِصلاح لازمی خیال کی جائے تو جلدی سرانجام دی جا سکتی ہے۔



بے کاری میں دن گذارنے پڑتے ہیں۔ اور اگر کوئی کام ملتا ہے تو وہ بھی کلرکی جس میں ہائی سکول اور کالج میں پڑھا لکھا کچھ کام نہیں دیتا۔

اگر یونیورسٹی سے نکلے ہوئے طلبا کو حکومت ملازمتیں دے تو اعلیٰ تعلیم خود بخود اپنا خرچ نکال لے۔ بھلا اُس تعلیم پر خرچ کرنے سے جس سے نہ تو طالب علموں کو اور نہ ہی قوم کو کچھ فائدہ ہو کیا حاصل؟ میری رائے میں تو جس چیز سے افراد کو فائدہ ہو اس سے قوم کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اعتراض کرنیوالے سب اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ موجودہ اعلیٰ تعلیم بلکہ وہ تعلیم بھی جو پرائمری۔ مڈل اور ہائی سکولوں میں دیجارہی ہے اصلی معنوں میں تعلیم نہیں ہے۔ اس لئے حکومت کو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ جب صحیح معنوں میں تعلیم مادری زبانوں کے ذریعے دی جائے گی۔ تو میرے کہنے کی گنجائش نہ رہیگی۔ اصلی تعلیم تو وہ ہے جس کی بنیاد قومیت پر ہو۔ اور حکومت اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دے۔ اور اس کا خرچ بھی اپنے سر پر لے۔ جب وہ مبارک وقت آئے گا تو لوگ خوشی سے ایسی تعلیم کے لئے روپیہ دیں گے۔ حکومت کو فائدہ ہو یا نہ ہو۔ اُن کو پرواہ نہ ہوگی۔ جو تعلیم آج کل دی جارہی ہے اُس سے حکومت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اگر میرا بس چلے تو میں حکومت کے خزانے سے ایسی تعلیم پر کچھ بھی خرچ نہ کرنے دوں۔

جواب۔ میرے مضمون کے معنی صاف سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اگر "حسب ضرورت" (یعنی حکومت صرف اُنکی تعلیم کا بندوبست کرے جنکو کام بھی مہیا کر سکے) کا مفہوم پورے طور پر لیا جاوے۔ میں نے بھی اپنے ملک کی غریبی اور جہالت کا نقشہ پیش نہیں کیا۔ میری نظر کے سامنے بھی ایک روز افزوں ترقی کرنیوالا ہندوستان ہی ہے۔ مگر وہ ترقی ہمارے حالات اور تمدن کے مطابق ہونی چاہیئے۔

ہم ایک نچلے درجے کے تمدن کو پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ اور نہ ہی گرتے پڑتے مغربی تمدن کی نقل اُتارنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی دن میرا خیال پورا ہو گیا تو اُمید ہے کہ ہمارے ملک کے سات لاکھ گاؤں قابلِ رہائش بستیاں ہونگی۔ جہاں کوئی بے علم نہ ہوگا۔ اور سب کے لئے کام ہوگا۔ کوئی بیکار نہ ہوگا۔ سب کو کھانے کو ملے گا۔ مکان ہوادار ہونگے اور پہننے کے لئے کھدر ہوگا۔ گاؤں صاف اور سُتھرے ہوں گے۔ یہ سب کچھ حکومت کریگی۔ اس کو سرانجام دینے کیلئے حکومت کو تعلیم پر بھی خرچ کرنا ہوگا۔ ورنہ کام کیسے چلیگا؟ ان ضروریات کو پورا کرنے کے ... کو لائبریریاں بھی قائم کرنی ہونگی۔ ہاں حکومت بی۔اے ... کے ڈھیروں کے ڈھیر نہ بنائے گی۔ موجودہ یونیورسٹیوں کے ... میں رٹ رٹ کر کند ذہن ہو جاتے ہیں۔ اور سوچنے ... جاتے ہیں۔ اُن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ انگریزی ... نری بولیں اور انگریزی زبان میں لکھیں۔ بیچاروں کو

میری رائے میں اگر کوئی ملک ترقی کرنا چاہتا ہے تو وہاں ہر علم کے سیکھنے کے لئے سہولتیں دی جانی چاہئیں۔ مثلاً ادبیات فلسفہ۔ تاریخ اور دیگر مجلسی علوم سیکھنے کا بندوبست ہونا چاہئے۔ ان علوم کو ادارہ کرنے کے لئے حکومت کو بہت سارا روپیہ خرچ کرنا ہوگا۔ اگر یہ کام لوگوں پر چھوڑ دیا گیا تو ملک ترقی نہیں کرے گا۔ اور دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ جائے گا۔ نہ ہی ملک آزاد ہو سکیگا۔ اور نہ ہی آزاد رہ سکیگا۔ اس لئے حکومت کو ہی اعلیٰ تعلیم کے ہر شعبے کا بندوبست کرنا چاہئے۔ لوگ بھی مدد دیں۔ مثلاً ہمارے ملک میں بھی نفیلڈ اور راک فلر جیسے دان دینے والے ہونے ضروری ہیں۔ مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ حکومت کچھ نہ کرے۔ حکومت کا فرض ہے کہ ہر طرح سے اعلیٰ تعلیم کا ادارہ کرے اور جہانتک ممکن ہو مدد بھی دے اور مشورہ بھی دے۔ آپ مہربانی کرکے سوال کے اس پہلو پر ذرا اور روشنی ڈالئے۔

آپ مضمون کے آخر میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ مجوزہ طریقہ تعلیم اگر جاری ہوگیا تو پہلے سے بہتر لائبریریاں ہمارے ملک میں قائم ہو جائیں گی۔ مگر آپ یہ نہیں بتلاتے۔ کہ یہ کیسے ہوگا۔ اور کس طرح لائبریریاں اور سائینس کے تجربے کرنے کے ادارے یہاں قائم ہو جائینگے۔ ایسے اداروں کیلئے تو روپیہ کی بڑی ضرورت ہوگی۔ اگر لوگ روپیہ کثیر تعداد میں نہ دیں تو کیا حکومت بھی اپنے فرض کو ادا نہ کرے اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہے؟"

۱۷

ایک واضح بیان

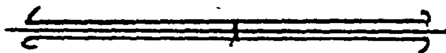
("ہریجن"۔ ۳۰ر جولائی ۱۹۳۸ء)

ایک صاحب جو پروفیسر رہ چکے ہیں میرے اعلیٰ تعلیم والے مضمون کے متعلق مجھے ایک لمبا خط تحریر فرماتے ہیں۔ کچھ اقتباس ذیل میں درج ہیں:۔

"آپ مہربانی کرکے اعلیٰ تعلیم کے مضمون پر مزید روشنی ڈالئے۔ میں آپ کے بہت سے خیالات کے ساتھ متفق الرّائے ہوں۔ خاصکر آپ کا یہ خیال کہ انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دینے سے ہمیں بڑا نقصان ہوا ہے۔ بالکل درست ہے۔ مجھے بھی اِس بات کا احساس ہے کہ جسے آجکل اعلیٰ تعلیم کہتے ہیں اُس میں بہت ملاوٹ ہے۔ ہے پیتل مگر دیکھنے میں سونا معلوم دیتی ہے۔ یہ بات میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں۔ کیونکہ میں بھی کالج میں ایک مدّت تک پڑھاتا رہا ہوں۔ آپ کا یہ کہنا کہ حکومت اعلیٰ تعلیم کا خرچ اپنی آمدنی سے نہ دے۔ یا یوں کہیئے کہ یونیورسٹیاں اپنا خرچ خود نکالیں۔ مجھے تو ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

تب آزاد ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ غیر ممالک کے تعلیم یافتہ طبقے کا مقابلہ کریں گے۔ جب تک یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ اس قسم کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں مجھے تو ڈر ہے کہ ہمارے ملک میں نہ آزادی ہوگی نہ قومی حمیت۔ ہمیں بڑی کوشش کر کے اس ذہنی۔ تعلیمی۔ اقتصادی۔ مجلسی اور سیاسی قید سے رہائی پانی ہے۔ بغیر مشقت کے کس طرح آزاد ہوں گے؟

میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں اعلیٰ تعلیم کا دشمن نہیں ہوں۔ مگر جس طریق پر اعلیٰ تعلیم ہمارے ملک میں دیجا رہی ہے میں اُسکا دشمن ہوں۔ میرے مجوزہ طریقۂ تعلیم کے جاری ہو جانے سے لائبریریاں اور سائینس کے تجربے کرنے والے ادارے پہلے سے بہتر ہو جائینگے۔ اور علمی تحقیق بھی بلند پایہ کی ہوگی۔ بے حد علم کیمیا کے ماہر۔ انجنیئر اور دیگر پیشہ ور پیدا ہونگے جو قومی خدمت کیا کریں گے اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات مہیا کرینگے۔ لوگ بھی خوب اپنے حقوق اور فرائض کو سمجھنے لگیں گے۔ یہ ماہرین اپنی مادری زبان میں بات چیت کرینگے۔ اور لوگ اُنکی بات سمجھیں گے۔ وہ اپنے علم سے دوسروں کو فیض پہنچائینگے کچھ کام ہوگا۔ اب تو سب لوگ نقّال سے بن گئے ہیں۔ دولت بھی سب میں برابر برابر بٹ جائیگی۔



صوبجات کی زبان کو فروغ دینے کے لئے اور انکی قدر و قیمت بڑھانے کے لئے عدالتوں کی زبان ہی اُس صوبے کی تعلیمی زبان بھی ہونی چاہیئے۔ ہر صوبے کی آئین ساز مجلس کی کارروائی بھی اُسی صوبے کی زبان میں ہو۔ اور اگر کسی صوبے میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہوں تو اُن میں ہو۔ ممبر تو یقیناً ایک ماہ کی محنت سے اپنے صوبے کی زبان میں کام چلا لیا کرینگے۔ مثلاً اگر کوئی شخص تامل جانتا ہے تو وہ بڑی آسانی سے تلیگو زبان کی صرف و نحو اور الفاظ سیکھ سکتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس دیگر زبانوں کو بھی۔ کیونکہ ملائیلم اور کنیریز تو تامل سے ملتی جلتی زبانیں ہیں۔ ہاں مرکزی آئین ساز مجلس میں ہندوستانی کام دے سکتی ہے۔

میری رائے میں تو اس سوال کا فیصلہ محکمہ تعلیم کے لوگ نہیں کر سکتے۔ کس زبان کے ذریعے بچوں کو تعلیم دی جائے یہ امر تو فیصلہ شدہ ہی ہے۔ ہر ایک آزاد ملک کو دیکھئے۔ نہ ہی محکمہ تعلیم کا یہ کام ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ کونسے مضامین پڑھائے جائیں۔ یہ تو عملی ضروریات کے مطابق خود ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ محکمہ تعلیم کا تو یہ کام ہے کہ قوم کی مرضی کے مطابق ایک سلسلۂ تعلیم کو بہترین طریق پر جاری کرے۔ جب ہمارا ملک آزاد ہو جائے گا تو ساتھ ساتھ فوراً ہی یہ بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ کہ کس زبان میں تعلیم دیجاوے۔ محکمہ ایک نظام کو مرتب کر دے اور اس کے مطابق کتابیں بھی تیار ہو جائیں گی۔

ہیں اس دلیل کو مان لینا اگر ہمارے لئے بچاؤ کی اور دوسری صورت نہ ہوتی۔ جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں علاج ہو سکتا ہے۔ بھلا یہ کیا دلیل ہوئی کہ موجودہ طریقۂ تعلیم نے ایک بوس پیدا کیا؟ کیا بوس اس طریقۂ تعلیم کی وجہ سے اِتنا لائق بن گیا؟ وہ تو سینکڑوں مشکلات کو عبور کر کے اس درجہ تک پہنچا۔ اُس کی لیاقت سے عوام نے کیا فائدہ اُٹھایا؟ ہم ایسا خیال کرتے ہیں کہ انگریزی جانے بغیر کوئی شخص بوس جیسا لائق نہیں بن سکتا تھا۔ یہ خیال ایک وہم ہے۔ جاپان کیطرف دیکھئے وہاں کے لوگ کیوں لائق ہیں؟

جس بُرائی کا میں نے ذکر کیا ہے وہ اتنی گھر کر گئی ہے کہ اُس کے دُور کرنے کے لئے کوئی زبردست علاج چاہیئے۔ کانگرسی وزراء اگر بالکل بُرائی کو نکال نہ سکیں تو بھی بہت حد تک اس کے بُرے اثرات کو زائل کر سکتے ہیں۔

اول تو یونیورسٹیاں اپنا خرچ آپ نکالیں۔ حکومت کو تو صرف اُن لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیئے جنکو وہ کام دے سکے علوم اور فنون سکھلانے کا کام لوگ اپنے ہاتھ میں لیں۔ جس زبان کے ذریعے اب تعلیم دی جا رہی ہے اُسے فوراً بدل دینا چاہیئے۔ اور تعلیم صوبوں کی اپنی زبان میں دی جانی چاہیئے۔ کتنا ہی ہرج ہو پرواہ نہیں۔ اگر اعلیٰ تعلیم کچھ عرصے کے لئے بالکل گڑبڑ ہو جائے تو بھی مضائقہ نہیں۔ موجودہ طریقۂ تعلیم بڑا ہی تباہ کن ہے۔ اور نقصان دہ بھی ہے۔

کی کیا ضرورت ہے؟ بہتر تو یہ ہوگا کہ کچھ طالب علم مختلف زبانیں سیکھ کر ادبی کتابوں کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کر لیں۔ ہمارے حاکموں نے ہمارے واسطے غلط راستہ نکالا۔ اب ہمیں ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ وہ غلط راہ بھی درست لگنے لگی ہے۔

لاکھوں ہندوستانی اس غلط طریقۂ تعلیم کے شکار ہو گئے ہیں۔ اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ قومیت کا خیال اُن سے کوسوں دُور ہے۔ میں تو اس بڑھتی ہوئی خرابی کو اِن آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میرے بہت سے ڈگری یافتہ دوست جب اُنہیں اپنے اندر کے خیالوں کو ظاہر کرنا پڑتا ہے تو گھبرا جاتے ہیں۔ ایسا سمجھو کہ اپنے گھر میں وہ اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں۔ مادری زبان میں وہ اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ تقریر کرتے ہوئے بہت سے انگریزی کے الفاظ بلکہ بعض دفعہ فقرے کے فقرے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا انگریزی کتابوں کے بغیر گذارہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ خط و کتابت بھی انگریزی میں ہی کرتے ہیں۔ میں نے اپنے دوستوں کی مثال اس لئے دی ہے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ خرابی کس قدر بڑھ رہی ہے۔ ابھی ہم نے بڑی کوشش کی ہے کہ گجراتی بولتے ہوئے انگریزی الفاظ استعمال نہ کریں۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں کالجوں میں تعلیم دینے سے جو نقصان ہو رہا ہے اُس کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ اگر کالجوں میں تعلیم پانے سے ایک جگدیش چندر بوس جیسا سائنسدان پیدا ہو جاتا ہے تو کافی ہے

ذریعے اور بھی زیادہ کر سکتا۔

آپ یہ نہ سمجھیں۔ کہ میں انگریزی زبان یا ادبیات کے برخلاف ہوں۔ خود "مرسحین" انگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ مجھے اس زبان سے بڑی محبت ہے۔ مگر انگریزی علم و ادب ہماری قوم کے لئے اتنا ہی مفید ہو سکتا ہے جتنا کہ انگلستان کی خوشگوار اور معتدل آب و ہوا اور وہاں کا قدرتی منظر۔ ہمارے ملک کو تو اپنی آب و ہوا اور اپنی قدرتی فضا سے ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اور ہمارے لئے تو اپنا علم و ادب ہی کار آمد ہو سکتا ہے۔ چاہے ہمارا ادب انگلستان کے ادب سے کہیں نیچا ہو۔ ہمیں تو آنے والی نسلوں کے لئے اپنی زمین پر ہی عمارت تعمیر کرنی ہے۔ اگر ہم غیر ملک کا ادب اختیار کریں گے تو ہمارا اپنا ادب جاتا رہے گا۔ کب تک ہم غیروں کے دست نگر رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ غیر ملکوں کے ادب کو ہم اپنی زبانوں کے ذریعے سیکھیں۔ رابندر ناتھ ٹھاکر (ٹیگور) کی بے مثل تصنیفوں کا مزا لینے کے لئے یہ تو ضروری نہیں کہ میں بنگالی سیکھوں۔ ترجموں سے بھی انسان لطف اٹھا سکتا ہے گجراتی لڑکے اور لڑکیوں کو ٹالسٹائی کی چھوٹی کہانیاں پڑھنے کے لئے روسی زبان پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ترجمے خرید کر پڑھ سکتے ہیں۔ انگریز تو فخر یہ کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے ادبیات کی اچھی اچھی کتابیں شائع ہونے کے بعد ایک ہفتے کے اندر انگریزی میں ترجمہ ہو جاتی ہیں۔ جو کچھ شکسپیئر اور ملٹن نے لکھا ہے بھلا اُس کے پڑھنے کے لئے مجھے انگریزی پڑھنے

اجنبی سا بن رہا تھا۔ اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ میں اپنی پوشاک بدلنے لگا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ یہ عام رواج سا ہو گیا تھا۔

پہلے تین سال جب میں ہائی سکول میں پڑھتا تھا میں نے کچھ بہت نہ سیکھا۔ دراصل اس عرصے میں طلبا کو سب مضامین انگریزی میں سیکھنے کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ ہائی سکولوں کا اصل منشا ہی یہ تھا کہ بچے خوب انگریزی زبان سیکھ لیں اور انگریزوں کا تمدن انہیں گھر کر جائے۔ ہمارے ہائی سکول میں جو تین سو طالب علم تعلیم پا رہے تھے گویا انکے علم کی قلعہ بندی ہو رہی تھی۔ عوام کو اُن کے علم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اب انگریزی ادبیات کو لیجئے۔ انگریزی نظم اور نثر کی کتابیں ہمیں پڑھنی پڑتی تھیں۔ کتابیں تو اچھی تھیں۔ مگر اُن کے پڑھنے سے مجھے کیا فائدہ تھا۔ عام لوگوں سے دُوری ہو جاتی تھی اور اُنہیں ہم سے کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ اگر میں انگریزی نظم و نثر کی کتابیں نہ بھی پڑھتا تو بھی مجھے کوئی خسارہ نہ تھا۔ بلکہ اگر میں وہی سات سال گجراتی سیکھنے میں لگاتا اور اپنی مادری زبان میں ریاضی۔ سائنس۔ سنسکرت اور دیگر مضامین سیکھتا تو میں اپنے ہمسایوں کو بھی کچھ سکھلاتا۔ ایک تو گجراتی زبان ترقی کرتی اور بہت ممکن تھا کیونکہ میں محنتی بھی تھا اور مجھے اپنے ملک سے بھی محبت تھی۔ میں عوام کی خدمت گجراتی زبان کے

نہ تھی کہ طلبا انگریزی غلط بولتے ہیں یا صحیح۔ اُن کا تلفظ بھی درُست ہے یا نہیں۔ یا وہ کچھ سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔ اُستاد کو کیا غرض پڑی تھی کہ وہ ان باتوں کی پرواہ کرتا۔ اُنکو خود انگریزی اچھی طرح سے نہ آتی تھی۔ اور آتی بھی کیسے۔ اُن کیلئے بھی طالب علموں کی طرح انگریزی غیر ملک کی زبان تھی۔ نتیجہ نہایت ہی خراب ہُوا۔ ہمیں بہت سی باتیں زبانی رٹنی پڑیں اِس طرح ہم بغیر سمجھے یاد کر لیا کرتے تھے۔ جب میرے اُستاد انگریزی میں ہمیں اقلیدس سکھایا کرتے تو میرے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ مجھے تو خاک بھی سمجھ میں نہ آتا تھا اور وہ اقلیدس کی تیرھویں شکل پر پہنچ جاتا تھا۔ اور مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اگرچہ گجراتی میری مادری زبان تھی ہے اور مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ مگر مجھے الجبرا اور اقلیدس کی اصطلاحیں اپنی زبان میں بالکل نہیں آتیں۔ مجھے اب معلوم ہُوا کہ جو مضامین میں نے انگریزی زبان کے ذریعے چار سال میں سیکھے۔ اگر اُنکو میں گجراتی میں سیکھتا تو ایک سال میں سیکھ لیتا۔ اور وہ مضامین مجھے اچھی طرح سمجھ میں بھی آ جاتے۔ اور آسان بھی ہوتے۔ گجراتی زبان بھی مجھے اچھی طرح سے آ جاتی اور میرے گھر میں کام دیتی۔ انگریزی سیکھنے سے تو میرے اور میرے گھر والوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہو گئی۔ کیونکہ وہ تو انگریزی بالکل نہ جانتے تھے۔ میرے والد صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں کیا پڑھتا ہوں۔ وہ بھلا کیسے مجھ سے دلچسپی لے سکتے تھے؟ تھے تو وہ بڑے عقلمند، اور سمجھدار مگر انگریزی کا حرف تک نہ جانتے تھے۔ میں اپنے گھر میں ہی

سے گذرنے سے بڑا خراب اثر پڑا ہے۔

۵- غیر زبان کے ذریعے تعلیم دینے سے ہماری قوم کی دماغی اور اخلاقی حالت پر بہت بڑا اثر ہوا ہے۔ ابھی تو ہم اُس ضرر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اور ہم جو اُس چکی میں سے خود گذرے ہیں اور اس طریقہ تعلیم کا شکار ہو چکے ہیں کیونکر بھلا اُسے بُرا کہیں گے؟

مذکورہ بالا عقائد کے متعلق میں اب دلیلیں پیش کرتا ہوں۔

بارہ برس کی عمر تک تو میں نے سب کچھ اپنی مادری زبان یعنی گجراتی میں سیکھا۔ میں اُن دنوں کچھ حساب۔ تاریخ اور جغرافیہ بھی جانتا تھا۔ پھر میں ہائی سکول میں داخل ہوا۔ تین سال تک پھر بھی میں گجراتی ہی میں سب مضمون پڑھتا رہا۔ مگر اُستادوں کا یہ کام ہوتا تھا۔ کہ وہ انگریزی زبان ہمارے دماغ میں ٹھونسیں۔ نصف سے زیادہ وقت ہمیں اُس زبان کے ہجے اور تلفظ وغیرہ سیکھنے میں خرچ کرنا پڑتا تھا۔ جب ہمیں یہ معلوم ہوا۔ کہ ہجے اور تلفظ جُدا جُدا چیزیں ہیں تو بڑا دُکھ ہوتا تھا۔ ہجے بھی زبانی یاد کرنے پڑتے تھے۔ خیر اِن باتوں کا میری دلائل کیساتھ کچھ واسطہ نہیں۔ پہلے تین سال کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی۔ چوتھے سال بڑی مشکل ہوئی۔ انگریزی حساب۔ الجبرا۔ اقلیدس۔ علم کیمیا اور علم الافلاک وغیرہ سب انگریزی کے ذریعے سیکھنے پڑے۔ اور اس پر طُرفہ یہ کہ سنسکرت اور عربی زبانیں بھی انگریزی میں سیکھنی پڑیں۔ اگر کوئی طالب علم جماعت میں گجراتی زبان میں بات بھی کرتا تو اُسے سزا دیجاتی تھی۔ اُستادوں کو اس بات کی پرواہ

شکر کرتا تھا۔ میں جماعت میں بھی بہت اچھا نہ تھا۔ پھر بھی میرے خیالات تعلیم کے متعلق اور خاص کر اعلیٰ تعلیم کے متعلق نہایت ہی پختہ ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ میرے ہموطن اُن پر غور کریں۔ اور اُنہیں اچھی طرح سے سمجھیں اور اگر ممکن ہو تو قبول کریں۔ میں ابھی تک ان خیالات کو دبا کر رکھتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں اُنکو ظاہر کرونگا تو لوگ ہنسی اُڑائینگے اور میں بدنام ہو جاؤں گا۔ اور میری عزت میں فرق آئے گا۔ اگر میں اپنے عقیدے کو ظاہر نہ کروں تو اُس کی درستی کس طرح سے ہو۔ میں تو چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی غلطیاں معلوم ہو جائیں تاکہ میں اُنہیں درست کرسکوں اب میں اپنے عقائد کو بیان کرتا ہوں۔ کچھ سالوں سے میں اُنہیں مانتا چلا آیا ہوں۔ اور جہاں کہیں میرا بس چلا ہے وہاں اِنپر عمل بھی کرایا ہے۔

۱۔ میں تعلیم کے برخلاف نہیں ہوں۔ تعلیم تو دنیا میں اعلیٰ سے اعلےٰ پیمانے پر دیجاسکتی ہے۔

۲۔ جہاں حکومت کی اپنی ضرورت پوری ہوتی ہو وہاں وہ تعلیم پہ جتنا جی چاہے خرچ کرے۔

۳۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مُلک کے خزانے سے خرچ کرنے کے میں برخلاف ہوں۔

۴۔ یہ میرا پکا یقین ہے۔ کہ کالجوں میں جو تعلیم پر خرچ ہوتا ہے وہ بالکل فضول ہے اور اس سے تعلیم یافتہ لوگوں میں بیکاری بڑھتی ہے۔ ململیا یعنی ہر دو لڑکے اور لڑکیوں کی جسمانی اور دماغی صحت پر اس چکی ہیں

۱۶

اعلیٰ تعلیم

(" ہریجن" - ۹ر جولائی ۱۹۳۸ء)

کچھ عرصہ ہوا میں نے بڑے عاجزانہ اور مختصر طریقے پر اعلیٰ تعلیم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اُن پر جناب سری نواس صاحب شاستری نے تنقید فرمائی تھی۔ اُنکو یہ حق ضرور حاصل ہے۔ میرے دل میں اُنکی بڑی عزت ہے۔ وہ بڑے وطن پرست اور عالم شخص ہیں۔ جب میں اُن کی رائے سے متفق نہیں ہوتا۔ تو مجھے بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ میں اعلےٰ تعلیم کے متعلق جو میرے خیالات ہیں اُنکو دوبارہ عرض کروں اور پہلے سے تاکیداً عرض کروں تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا آپس کا اختلاف کس قدر ہے۔

میں اپنی خامی کا اقرار کرتا ہوں۔ میں نے کبھی دارالعلوم (یونیورسٹی) میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہائی سکول میں مَیں معمولی طلبا میں سے تھا۔ جب کبھی مَیں امتحان پاس کر لیتا۔ تو پرماتما کا

کامیابی ضرور ہوگی۔ میں تو ہر خیال کو عملی جامہ پہنا سکتا ہوں۔



سے غلامی ہوئی۔ ہاں اگر آپ کلوں کے دلدادہ ہیں تو میں مجبور ہوں۔ میرے خیال میں تو اور کوئی تجویز نہیں آتی۔

جلسے کے اختتام پر گاندھی جی نے کارروائی کو بند کرتے ہوئے فرمایا:۔

اِن تجاویز پر غور کرتے ہوئے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا موجودہ پرائمری مڈل اور ہائی سکولوں کو بند کر دیا جاوے؟ میں تو بلا تأمل کہوں گا۔ کہ ہاں بند کر دینا چاہیئے۔ مگر آخری فیصلہ تو وزرا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر استاد جو موجودہ سکولوں میں پڑھاتے ہیں میرا کہنا مانیں تو فوراً ہی یہ طریقۂ تعلیم جاری ہو سکتا ہے۔ جہاں ابھی تک کوئی سکول نہیں وہاں نئے طریقے کے سکول بنائے جا سکتے ہیں۔ میں خود سیگاؤں اور واردھا میں اس قسم کے سکول قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔

بعض لوگ ابھی تک اس مجوزہ طریقۂ تعلیم کے متعلق شاکی ہیں۔ وہ اپنے شکوک میرے سامنے رکھیں تاکہ میں غلط فہمی کو دور کر سکوں۔ میرے خیال میں پروفیسر شاہ کا ڈر موہوم ہے۔ نئی قسم کے سکول ایک دم تو قائم نہیں کئے جا سکتے۔ ہمارے ملک میں سات لاکھ کے قریب گاؤں ہیں۔ اس طریقۂ تعلیم کو جبری اور ہر دلعزیز بنانے میں وقت خرچ ہوگا۔ پہلے تو کچھ نمونے کے سکول جاری کرنے ہونگے۔ اگر طریقہ ہی ناکامیاب ہو۔ تو کیا ہو سکتا ہے؟ مگر مجھے تو کوئی شک ہی نہیں

میرا یہ بھی خیال ہے کہ پہلے سال تو کچھ نقصان رہے گا۔ مگر تیسرے سال خرچ نکل آئے گا۔ میں یہ ذاتی تجربے سے کہتا ہوں۔ بھلا اس طریقۂ تعلیم میں غلامی کہاں؟ ہاں اگر اُستاد اور انسپکٹر نکمے ہوں تو البتہ نتیجہ امید افزا نہیں ہو سکتا۔

میری خاطر آپ اِن تجاویز کو منظور نہ فرمائیے۔ میں تو اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ اور جبر سے آپ کو کوئی بات منوانا نہیں چاہتا آپ خوب غور و خوض کر لیجئے اور پھر انکو منظور کیجئے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ تھوڑے عرصے بعد انکو چھوڑنا پڑے۔ یہ طریقۂ تعلیم ضروری نہیں کہ سات سال میں مکمل ہو۔ نو سال بھی لگ جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ میں پروفیسر شاہ صاحب کے ساتھ متفق الرائے ہوں۔ یعنی حکومت کا فرض ہے کہ جن لوگوں کو کام نہ مل سکے اُنکو کام دے ہر ایک فرد کو کام بھی ملنا چاہیئے۔ اور اُسے خوراک بھی ملنی چاہیئے۔ روپیہ چاہے ملے یا نہ ملے۔ خدا نے ہمیں اس واسطے تو پیدا نہیں کیا۔ کہ ہم کھائیں۔ پیئیں اور موج کریں۔ ہمیں تو کام کرنا ہے۔ پسینہ بہانا ہے اور کما کر کھانا ہے۔ ہمارے ملک میں تو کام کافی ہے۔ ایک طرح تو ہم ۳۵ کروڑ انفرادی کلیں ہیں۔ ہمیں مُردہ کلوں کو کیا کرنا ہے؟ ہم میں سے ہر ایک کو آٹھ گھنٹے روز کام کرنا چاہیئے۔ کام کرنے سے انسان غلام تو نہیں بن جاتا۔ کیا آپ جب اپنے ماں باپ کا کام گھروں میں کرتے ہیں تو اس میں غلامی پائی جاتی ہے؟ سکولوں میں جب ہم دستکاری سیکھتے ہیں تو وہ کس طرح

تاریخ۔ جغرافیہ حساب ۔ سائینس ۔ زبان۔ مصوری اور موسیقی وغیرہ بھی سکھلانا چاہتا ہوں ۔ یہ سب مضامین بھی باقاعدہ سکھلائے جائینگے۔ ڈاکٹر بھاگوت صاحب کہتے ہیں کہ سکولوں میں 9 گھنٹے پڑھائی ہو۔ میں اُن سے اتفاق نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ تو بچوں پر ظلم کرنا ہوگا۔ دن بھر میں پانچ گھنٹے پڑھنا کافی ہوگا۔ کیونکہ لڑکوں کو سکول میں پڑھا ہؤا گھر پہ یاد بھی تو کرنا ہے۔ اگر اسی طرح سے سات سال تک برابر پڑھائی ہوتی رہے تو ضرور خرچ نکل آئے گا۔ اگر پہلے سال بچہ دو پیسے روز بھی کمائے تو دوسرے سال ضرور ایک آنہ روز کمائیگا۔ اُس کے کمانے کی طاقت سال بسال بڑھتی جائے گی ۔ اور بڑے ہوکر وہ اپنی روزی اچھی طرح سے کما لیگا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دیہاتی سکولوں میں صرف زراعت یا کھیتی باڑی سکھلائی جاوے ۔ مگر روپیہ کہاں سے لاویں؟ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں جو علم زراعت آج کل سکھلایا جاتا ہے ۔ وہ تو کسی مصرف کا نہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ دیہاتی زندگی کے ساتھ اُس کا کچھ واسطہ نہیں۔ اگر آپ میری تجویز منظور کرلیں اور اچھے اُستاد میسّر ہوں تو دیہات والوں کو بڑا فائدہ ہوسکتا ہے ۔ طُلبا اپنے اُستادوں کے ساتھ کھیتوں میں چلے جایا کریں گے۔ اور وہاں ہل چلانا۔ بیج بونا۔ پانی دینا اور کھیتوں کو بنانا سیکھ لیں گے ۔ ایسا کرنے سے اُنکی ورزش بھی ہوجایا کرے گی اور دیگر کھیل بھی درکار نہ ہوں گے۔

ہمارا کلوں کے بغیر گذارہ نہیں تو یہ تجاویز جو میں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں فضول ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے۔ کہ کلیں ہمارے گاؤں کو زندہ رکھ سکتی ہیں؟ اور کیا کلوں سے ہم دیہات میں تعلیم پھیلا سکتے ہیں؟ کیا آپ گاؤں کے بچوں کو کلوں کے ذریعے تعلیم دینا چاہتے ہیں؟ مجھے یقین کامل ہے کہ ہمارے ملک میں ایسا کرنا بالکل ناممکن ہے۔ کلوں کے جاری ہونے سے بہت لوگ بے روزگار ہو جائینگے۔ اگر آپ کا خیال ہو کہ کلیں بہت ضروری ہیں اور اُن کے بغیر ہمارا گذارا نہیں تو آپ ان تجاویز کو بالکل نامنظور فرمایئے۔ آپ اور تجویزیں پیش کیجئے۔ میں بڑا شکر گذار ہوں گا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ہمیں بتلایا ہے کہ پروفیسر ڈیوی صاحب کی تجویزیں امریکہ میں بالکل ناکامیاب رہیں۔ اُنکی ناکامی کی وجہ میرے خیال میں خرچ کی زیادتی نہیں تھی بلکہ وہ اس واسطے ناکامیاب ہوئیں کیونکہ اُن کا اطلاق بڑے پیمانے پر نہ ہو سکتا تھا۔ میری تجویز اور طرح کی ہے اور دیہات کیلئے ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر میرا طریقہ تعلیم جاری کر دیا گیا تو یہ ایک طرح سے سکولوں میں غلامی سکھلانا ہوگا۔ یوں تو اچھی سے اچھی تجویز جب خراب لوگوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ تو بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ جن لوگوں کا اس طریقہ پر پورا وشواس نہیں اُنہیں انکو چلانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اور وہ اسے نہ چلائیں۔

میں ایک اور بات صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ میں گاؤں کے بچوں کو صرف دستکاری ہی سکھلانا نہیں چاہتا۔ میں تو دستکاری کے ذریعہ

کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا - یہ کام بھی ویسے ہی ہوگا - شروع میں دیہاتی سکولوں میں کچھ نہ کچھ روپیہ ضائع ہوگا - مگر ہوشیار اُستاد بچوں کو بہت ضائع نہ کرنے دیں گے - یہ تو سچ ہے کہ سکولوں میں جو اشیا بنائی جائیں گی وہ بازار سے مہنگی ہونگی - مگر مقابلے کا سوال بالکل نہیں اُٹھ سکتا - جو حال کھدر کا ہوگا وہی ان اشیا کا بھی ہوگا - گاؤں کے لوگ جو چیزیں بنائیں گے اُن کا بھی مقابلہ سکولوں کی ساختہ اشیاء کے ساتھ نہ ہوگا - کاغذ بنانے کی دستکاری کو لیجیئے - اب تو گاؤں میں کاغذ بالکل نہیں بنایا جاتا - سرب ہند گاؤں کی دستکاریوں والی ایسوسی ایشن اس کا بندوبست کر رہی ہے - لوگ ہاتھ سے بنا ہوا کاغذ خریدنا چاہتے ہیں - چاہے انہیں مہنگا ہی پڑے - اسی طرح سکولوں کے طلبا کی بنائی ہوئی چیزیں لوگ خریدیں گے - اگر کھجوروں سے گڑ بنایا جائے تو وہ بھی بک سکتا ہے - چونکہ کھجوروں سے گڑ بنانے کا ہمارے ملک میں رواج نہیں ہے - کھجور کے گڑ کا دوسرے گڑ کے ساتھ کوئی مقابلہ نہ ہوگا - وہ گڑ تو گنے کے رس سے بنایا جاتا ہے -

اب کلوں کو لیجیئے - میری رائے میں کلوں کی ہمیں بالکل ضرورت نہیں - ہمیں کھدر استعمال کرنا چاہیئے - کپڑا بنانے کی کلیں ہم کیا کریں گے! ہمیں تو سب کپڑا گاؤں میں بنانا چاہیئے - ہم کیوں کلوں کے بھروسے رہیں؟ کلوں کو برتتے برتتے ہم خود کلیں بن گئے ہیں - ہاتھ سے بنی ہوئی چیزوں کی ہم کچھ قدر نہیں کرتے - اگر آپ کا اب بھی یہ خیال ہے - کہ

کھیتوں میں جاکر روئی جمع کرنا سیکھیں۔ اُس کے بعد وہ روئی کاتنا
میں۔ پہلے تکلی سے پھر چرخے سے۔ بعد میں تکلیاں بنانا اور
خے بنانا بھی سیکھیں۔ لوہار اور بڑھئی کا کام بھی بچے سیکھ سکتے ہیں
طرح اگر سات سال کے لئے کورس تیار کیا جاوے تو یہ طریقہ تعلیم
ر کامیاب ہو سکتا ہے۔

پروفیسر شاہ کا خیال ہے کہ اگر یہ طریقۂ تعلیم جاری کر دیا گیا تو
ر ور لوگوں میں اور سکولوں کے طلبا میں ایک قسم کا غیر مناسب مقابلہ
رع ہو جائے گا۔ میرے خیال میں تو یہ موہوم سا ڈر ہے۔ کوئی
نو معلوم نہیں ہوتی۔ اگر بالفرض مقابلہ ہو بھی تو پہلے کارخانوں
ساتھ ہوگا۔ اور پھر چرخہ سنگ کیساتھ ہوگا۔ کارخانے اور سنگ اس
لہ کی کیا پرواہ کرتے ہیں۔ آپ اس بات کو بھول نہ جائیے۔ کہ یہ مجوزہ
یہ تعلیم بالخصوص گاؤں کے لئے ہے۔ جب وزراء ملک میں ایک صحیح
قائم کر دیں گے تو لوگ سکولوں کی تیار کردہ اشیاء زیادہ قیمت دیکر
خرید کر لیا کریں گے۔ فروخت کرنے میں کوئی دِقت نہ ہوگی۔
خصوصاً کپڑا جو سکولوں میں تیار ہوگا اُسے حکومت زیادہ قیمت دیکر
بھی خرید لیا کریگی۔

مثلاً یرواڈا جیل میں جو چھاپہ خانہ ہے اُسے دیکھئے۔ اگرچہ چھپائی
وہاں مہنگی ہے۔ پھر بھی حکومت سب کچھ وہاں ہی چھپواتی ہے۔ مقابلے

ـلہ Spinners' Association

وہاں تو تشدد ایک طرح سے دھرم ہے۔ اور اُن کے کُل ادارے "تشدد" کی بنا پر چلتے ہیں۔ میں رُوسی تجربے کی اہمیت کو خوب سمجھتا ہوں۔ مگر وہ بھی تشدد اور جبر پر قائم کیا گیا ہے۔ اگر ہندوستانی عدم تشدد کے اصول پر کام کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے لئے مجوزہ طریقۂ تعلیم لازمی ہو جاتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ انگلستان لاکھوں روپے تعلیم پر خرچ کرتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس امریکہ بھی۔ مگر ہم یہ بات بھول جاتے ہیں۔ کہ یہ دولت دوسروں کی جیب سے نکلتی ہے۔ مغربی لوگ دولت کمانے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں۔ لوٹ گھسوٹ کرنے میں طاق ہیں۔ وہ جتنا دل چاہے اپنے بچوں کی تعلیم پر خرچ کریں۔ ہم نہ ایسا کر سکتے ہیں۔ نہ ہی کرینگے۔ ہمارے لئے تو کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں۔ کیونکہ ہمیں تو عدم تشدد کے اصول پر چلنا ٹھہرا۔"

بعد دوپہر جو اجلاس منعقد ہوا اُس میں اعتراضوں کا جواب دیتے ہوئے گاندھی جی نے فرمایا:۔

صبح کے وقت جو مجوزہ طریقۂ تعلیم آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے اُس پر عمل درآمد ہونے سے ہمارے بچے ایک تو اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے اور دوسرے دلیر بھی ہو جائیں گے۔ سات سال تک بچے صرف تکلی ہی نہیں چلاتے رہیں گے بلکہ میری رائے میں پہلے سال بچوں کو تکلی چلانا سکھانے سے پہلے رُوئی دُھننا سکھلانا چاہئے۔ پھر

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کا اس طریقۂ تعلیم (یعنی ہاتھ کا کام سکھلا کر تعلیم دینا) سے متعلق کیا خیال ہے - اس طریقے کی کامیابی تو اسی بات میں ہے کہ بچے اپنی تعلیم کا خرچ اپنی محنت سے پیدا کریں - سات سال کا تعلیمی کورس ختم کرنے کے بعد بچوں کے سر پر کوئی خرچ کا بوجھ بھی نہ ہو اور وہ اپنی روزی بھی کما سکیں - یہ ہے میرا مُدعا -

ہمارے ہاں فرقہ وارانہ جھگڑے اور لڑائیاں بھی ہوتی رہتی ہیں - یہ کوئی عجیب بات نہیں - انگلستان میں بھی جنگِ گلاب¹ ہوتی رہی ہیں - اور آج بھی سب دنیا انگریزوں کے ہر جگہ پاؤں پھیلانے پر ناراض ہے - اگر ہم اس خانہ جنگی اور بین الاقوامی جنگ کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں نوجوانوں کی تعلیم کے طریقہ کو (جیسے میں نے عرض کیا ہے) ایک مضبوط اور پوتر بنیاد پر رکھنا ضروری ہے - یہ طریقہ عدم تشدد سے تعلق رکھتا ہے - میں نے یہی طریقہ شراب خوری کو بالکل بند کرنے کے لئے بتلایا تھا - اور اگر ہمارا خزانہ بھرا بھی رہے اور آمدنی میں کوئی کمی نہ ہو تو بھی یہ طریقۂ تعلیم بہت اچھا رہے گا - بشرطیکہ ہم بچوں کو شہری عادات نہ سکھلانا چاہتے ہوں - اول تو ہمارے بچوں کو اپنے ملک کا تمدن اور تمیز اور آداب سیکھنا ہے - یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ہم اُن کو دستکاری کے ذریعے تعلیم دیں گے - یعنی وہ تعلیم بھی حاصل کرتے جائیں اور خرچ بھی نکالتے جائیں - ہمیں یورپ کی نقل تو نہیں اُتارنی

1o Wars of Roses

حالت میں بچے نکمے نکلیں گے۔ نہیں اگر بچے خود اپنے ہاتھ سے محنت کر کے اپنی تعلیم پر خرچ کریں تو وہ گویا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں گے یہ طریقہ تعلیم سب کے لئے ہو گا۔ ہندو، مسلمان۔ پارسی۔ عیسائی وغیرہ سب اسی طریقہ پر تعلیم پائیں گے۔ لوگ اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں۔ کہ میا مذہبی یا دھارمک تعلیم پر کیوں زور نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ میں کہتا ہوں کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھنا ہی عملی دھرم ہے۔

حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کے تعلیم یافتہ طلباء کے لئے کام مہیا کرے۔ اُستادوں کے متعلق پروفیسر شاہ کے خیال کے مطابق جبری بھرتی ہونی چاہیئے۔ اُنہوں نے اٹلی اور دیگر ممالک کی مثالیں دے کر اس موضوع پر بڑی روشنی ڈالی ہے۔ اگر مسولینی اٹلی کے نوجوانوں کو ملکی خدمت کے لئے تشویق دے کر تیار کر سکتا تھا۔ تو کیا ہم ایسا نہیں کر سکتے ہا اگر ہم بھی نوجوانوں کو کہیں کہ ملازمت شروع کرنے سے پہلے ایک سال تک ملک کی جبری خدمت میں شرکت کریں تو بھلا یہ کوئی غلامی ہوئی؟ گزشتہ سترہ سال کے عرصہ میں نوجوانوں نے قومی آزادی کی جنگ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اگر میں اُن سے کہوں کہ تم اپنی زندگی کا ایک سال ملک کی خدمت کے لئے وقف کرو تو کیا یہ کوئی بڑی بات ہے؟ اگر بالفرض اس کے متعلق قانون بھی بنایا جائے تو بھی ایسی خدمت کو جبری نہیں کہنا چاہیئے۔ کیونکہ ملک کے نمائندے اس قانون کو اکثریت کی رائے سے پاس کریں گے۔

کمزور ہیں۔ میری رائے میں ورزش جبری طور پر سکھلانی چاہیئے۔ اور طلبا جب ورزش کرتے ہوں تو ساتھ ساتھ باجہ بجنا چاہیئے۔

مجھ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں کتابی تعلیم کے بالکل برخلاف ہوں۔ یہ درست نہیں۔ میں تو تعلیم دینے کا راستہ یا طریقہ بتلا رہا ہوں۔ لوگ تو یہ بات بھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کہ تعلیم کا خرچ خود بخود نکل سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں بھلا بچوں کے کام کرنے سے کہیں لاکھوں اور کروڑوں کا خرچہ پورا ہو سکتا ہے۔ کس قدر بوجھ بچوں کے سر پر ڈالا جا سکتا ہے۔ اور کتنا روپیہ فضول ضائع جائے گا۔ مگر یہ ڈر سب فضول ہے۔ لوگ کہتے ہیں بچوں پر بوجھ پڑے گا۔ میں کہتا ہوں بچے تباہ ہونے سے بچ جائیں گے۔ تکلی چلانا سمجھو ایک طرح کا کھلونا ہے۔ کھلونا بھی ایسا جو ساتھ ساتھ آمدنی بھی دے۔ اب بھی تو بچے اپنے والدین کے کام میں ہاتھ بٹاتے ہی رہتے ہیں۔ سیگاؤں میں بچے زراعت کے کام کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے والدین کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے رہتے ہیں۔ جب بچے تکلی چلانا سیکھ جائیں گے اور اپنے والدین کے ساتھ بھی کام میں حصہ لیں گے۔ تو ساتھ ساتھ انکو اس بات کا بھی احساس ہو گا۔ کہ ہمیں اپنے گاؤں کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے اور ملک کی بھی خدمت کرنی چاہیئے یعنی ہمیں احسان فراموش نہیں ہونا چاہیئے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تعلیم دی جا سکتی ہے۔

اگر وزرا یہ خیال کریں کہ ہم تعلیم پر روپیہ خرچ کریں گے تو اس

ہیں نے اِن تجاویز کو وزراء کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اُن کا جی چاہے منظور کریں یا نامنظور کریں۔ میری رائے میں تو سکولوں میں تعلیم کا مرکز تکلی ہونا چاہیئے۔ پہلے سال تو سب کچھ ساتھ ساتھ سکھلانا چاہیئے تکلی سے اتنا سوت تو مل جائے گا جس سے کپڑا بُن کر اگر قیمت وصول کی جائے تو خرچ کے لئے کافی ہو۔ یہ سب سُوت بچے اپنے ہاتھ سے کاتیں گے۔ بچوں کا بنایا ہوا سُوت تو اُن کے والدین بھی خریدینگے اس سات سالہ کورس میں تکلی چلانے کے علاوہ کپڑے کا بُننا۔ رنگنا اور نئے نئے نمونوں کا کپڑا بنانا بھی شامل ہوگا۔

بچے جو ہاتھوں سے اشیاء بنائیں گے اُنکی فروخت سے جو آمدنی ہوگی اُس سے اُستادوں کی تنخواہ نکل سکتی ہے۔ میں یہ بات معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا یہ ممکن ہے یا نہیں۔ اور تو کوئی طریقہ ہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جس سے کہ وڑوں بچے تعلیم حاصل کرسکیں۔ ہم بھلا کب تک اس بات کا انتظار کرتے رہیں۔ کہ حکومت کی آمدنی بڑھے اور وائسرائے صاحب فوجوں کا خرچ کم کریں تب ہمارے بچے تعلیم حاصل کریں۔ آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ مجوّزہ طریقہ تعلیم میں حفظانِ صحت۔ پاکیزگی اور خوراک وغیرہ کے اصول بھی شامل کئے جائیں گے۔ اور طلباء کے لئے لازمی ہوگا۔ کہ وہ اپنا گھر کا کام بھی کریں اور اپنے والدین کو بھی اُن کے کام میں مدد دیں۔ آج کل کے طلباء صحت اور صفائی کا بالکل خیال نہیں کرتے اور ہاتھ سے کام کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور جسمانی طور پر بھی

ساری کی ساری دستکاری اصولاً اور عملاً سکھلانے سے تعلیم خود بخود ہو جائے گی۔ یہ ہے اصلی علاج۔ مثلاً اگر تکلی کے ذریعے سوت کاتنا سکھلا دیا جائے تو الیناکہ نے سے روئی کی مختلف اقسام اور روئی کہاں پیدا ہوتی ہے اور کس قسم کی زمین میں پیدا ہوتی ہے۔ ان باتوں کا علم بھی ہو جائے گا۔ کیونکہ ہمارے ملک میں کپڑا بننا بند ہو گیا اور انگریزی راج میں کیا ہوا؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں بھی سمجھ میں آجائیں گی۔ اور ساتھ حساب یا ریاضی کا بھی علم ہو جائے گا۔ میں یہ طریقہ تعلیم اپنے پوتے پر آزما رہا ہوں۔ اُسے معلوم بھی نہیں ہوتا۔ کہ وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ وہ تو ہنستے کھیلتے اور گاتے ہوئے علم کو حاصل کرتا جاتا ہے۔ میں تکلی کا ذکر اس لیۓ کرتا ہوں اور اس کے استعمال پر زور دیتا ہوں کیونکہ مجھ پر اس کی اصلی خوبیاں روشن ہو گئی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ کپڑا بُننے کی دستکاری سارے ملک میں سکھلائی جاسکتی ہے۔ اور علاوہ اس کے تکلی بڑی سستی ہے۔ اگر آپ کوئی اور دستکاری بتلا سکتے ہیں جو ویسی ہی مفید ہو۔ تو بلا تأمل بتلائیے تاکہ اُس پر غور کیا جاوے مجھے تو پورا یقین ہے کہ تکلی ہماری مشکل کا ایک عملی حل ہے۔ ہمیں اپنے ملک کی افسوسناک اقتصادی حالت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے کھدر کا تعمیری کام شروع ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سات صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہو گئیں۔ اور جیسے وہ اس کام کو کرتی گئیں وہ کامیاب ہوتی چلی گئیں۔

میں نے خود ان کاموں کو کلن؁ پاش صاحب سے سیکھا۔ اُنہوں نے یہ کام ایک Monastery میں سیکھا تھا۔ میں خوب جانتا ہوں۔ کہ میرے لڑکوں اور دوسرے لڑکوں کو ان کاموں کے سیکھ لینے سے کچھ نقصان نہیں ہوا۔ مجھے اُنہیں تسلی بخش تعلیم دینے کا موقعہ نہیں ملا۔ کیونکہ وقت بہت کم تھا۔ اور مجھے بہت کام رہتا تھا۔

جو تجویز میں آپ کے سامنے آج رکھنا چاہتا ہوں اُس سے یہ مراد نہیں کہ جہاں اور مضامین پڑھائے جاتے ہیں ساتھ ساتھ ایک دستکاری بھی سکھلا دی جائے۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ دستکاری یا صنعت و حرفت کے ذریعے ہی تعلیم دی جائے۔ آپ یہ اعتراض اُٹھا سکتے ہیں کہ وسطیٰ؁ زمانہ میں طلبا کو صرف دستکاری سکھلا دی جاتی تھی۔ مگر وہ لوگ تعلیم یافتہ نہیں کہے جا سکتے تھے۔ مطلب صرف یہ ہوتا تھا۔ کہ وہ دستکاری سیکھ جائیں۔ اُنکی دماغی طاقتیں نشو و نما پائیں یا نہ پائیں۔ ہمارے زمانہ میں اس کے اُلٹ ہو رہا ہے۔ لوگ اپنے ابا و اجداد کے پیشے بالکل بھول گئے ہیں اور کلرک بن گئے ہیں۔ اور گنج کے پیشوں سے ناواقف ہیں۔ اُس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ گاؤں میں کوئی اچھا لوہار یا بڑھئی ہی نہیں ملتا۔ دستکاریاں تو رہی ہی نہیں۔ چرخے کی کچھ قدر نہیں۔ انگریز؁ اُسے اُٹھا کر لنکا شائر لے گئے ہیں۔ اور اس سے وہ کام لیا جو ظاہر ہی ہے۔ فی الحال کلوں سے کپڑا بنانے کے سوال کو رہنے دیجئے۔

؁ Middle Ages ؁ Lancashire

دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اور اب میں جبکہ سیگاؤں میں رہ رہا ہوں میں خوب اچھی طرح سے قومی تعلیم کے سوال کو مطالعہ کر سکتا ہوں۔ میرا یہ وشواس ہے۔ کہ اگر ہم دیہات کی حالت سدھارنا چاہتے ہیں تو ہمیں پرائمری۔ مڈل اور ہائی سکولوں کی تعلیم کو ایک کر دینا ہوگا۔ مجوزہ طریقہ تعلیم جو یہاں پیش ہے وہ بالخصوص دیہات کے لئے نہایت موزوں ہوگا۔ مجھے کالجوں کا کوئی تجربہ نہیں۔ اگرچہ میں سینکڑوں کالج کے طلباء سے ملا ہوں۔ اور اُن سے بات چیت بھی کی ہے۔ بلکہ خط و کتابت بھی کی ہے۔ مجھے اُنکی ضروریات۔ کمزوریوں اور علالتوں کا بھی علم ہے۔ مگر فی الحال ہمیں صرف سکولوں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ پہلے اُن کا سوال حل ہو جائے تو کالجوں کا سوال حل کرنے میں مشکل نہ ہوگی۔

مجھے تو پورا یقین ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم صرف تضیع اوقات اور فضول خرچی ہی نہیں بلکہ صاف طور پر ضرر رساں بھی ہے۔ بہت سے لڑکے تو والدین کے کسی کام کے نہیں رہے۔ اور جس کام میں والدین مشغول ہوتے ہیں اُس کام سے بھی جاتے رہتے ہیں۔ بُری عادتیں بھی سیکھ جاتے ہیں۔ اور شہری لوگوں کی نقل کرنے لگتے ہیں۔ اور جو کچھ تھوڑا بہت سیکھتے بھی ہیں وہ بھی کسی معنوں میں تعلیم نہیں کہی جا سکتی۔ میرے خیال میں اگر کوئی علاج ہے تو یہ ہے کہ بچوں کو کوئی دستکاری یا ہاتھ کا کام سکھلایا جائے۔ مجھے خود بھی اس کا تجربہ ہے۔ میں نے اپنے لڑکوں کو جنوبی افریقہ میں اور دوسروں کو بھی ایسی دستکاریاں مثلاً بڑھئی کا کام یا جوتیاں بنانا وغیرہ سکھلایا۔

مجوزہ طریقۂ تعلیم یا واردھا سکیم

("ہریجن" - ۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۷ء)

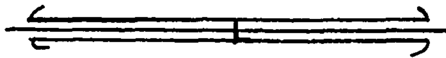
سرب[1] ہندنیشنل یا قومی تعلیمی کانفرنس جو واردھا میں منعقد ہوئی تھی اُس موقعہ پر گاندھی جی نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا:-

"جو خیالات میں آج آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں وہ ایک طرح سے نئے ہیں۔ کم سے کم میرے لئے اُنکے پیش کرنے کا طریقہ نیا ہے۔ اگرچہ اُنکی تہ میں جو تجربہ ہے وہ پرانا ہے۔ تجاویز جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں نہ صرف سکولوں بلکہ کالجوں سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔ مگر مجھے سکولوں کی طرف خاص توجہ دینی ہے۔ پرائمری تعلیم میں مڈل اور ہائی سکول بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ دراصل ایک ہی سلسلہ تعلیم ہے جو ہمارے مُلک کے دیہات میں بھی جاری ہے۔ جہاں میں ۱۹۱۵ء سے لیکر اب تک گھومتا رہا ہوں۔ میں نے گاؤں کے حالات کا یہ نسبت اوروں کے بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ مجھے جنوبی افریقہ میں بھی

---

[1] All-India

ایک دارالعلوم کھولنا چاہیں تو انہیں فراخ دلی سے اجازت دیجائے کیونکہ ایسے دارالعلوموں کا حکومت کے سر پر کوئی خرچ نہ پڑے گا۔ سوائے اس کے کہ حکومت کو ایک مرکزی تعلیمی ادارہ قائم کرنا ہوگا۔ مذکورہ بالا تجاویز سے یہ مراد نہیں کہ حکومت اُن اداروں کو بھی قائم نہ کرے جو خود حکومت کے چلانے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ تجویزیں اگر منظور کر لی جاویں تو حکومت کی بڑی بھاری مشکل آسان ہو جائیگی۔ یعنی نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا سوال حل ہو جائے گا۔ اور نوجوانوں ہی سے قوم بنتی ہے۔



کرنے کی ضرورت نہیں اور وہ یہ ہیں :۔

رُوئی ۔ اُون اور ریشم کے متعلق جتنے کام ہیں ۔ مثلاً اُنہیں اکٹھا کرنا ۔ صاف کرنا یا بیلنا وغیرہ ۔ کاتنا ۔ رنگنا ۔ تانا بانا بنانا ۔ دھاگہ بٹنا اور بُننا ۔ سوئی کا کام ۔ سلائی وغیرہ ۔ اسی طرح سے کاغذ بنانا ۔ جلد سازی میز اور کرسیاں بنانا اور گُڑ تیار کرنا سب دستکاریاں ہی تو ہیں ۔

سکولوں میں تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو لڑکے اور لڑکیوں کو اپنی روزی کمانے کے قابل بنا دے ۔ اور حکومت اس بات کا ذمہ لے ۔ کہ جو بھی دستکاری طلبا سیکھیں اُس کے متعلقہ کام اُنکو دیئے جاویں ۔ اور جو کچھ وہ اپنے ہاتھ سے بناویں حکومت اُن کی ساختہ اشیاء کو ایک مقررہ قیمت پر خرید ے ۔

ج ۔ اعلیٰ تعلیم دینے کا انتظام لوگ خود کریں ۔ علیٰ ہذا القیاس ملک کی دیگر ضروریات مثلاً کارخانے ۔ صنعت و حرفت ۔ علوم و فنون وغیرہ کا بندوبست خود کریں ۔

حکومت جو دارالعلوم[1] بنائے وہ صرف امتحانات کا بندوبست کریں اور طلبا سے فیس لے کر اداروں کا کام چلائیں ۔ یہ دارالعلوم اعلیٰ تعلیم کا ادارہ کریں اور تعلیم کے مختلف شعبوں کے لئے مناسب کتابیں وغیرہ تیار کروائیں ۔ پرائیویٹ سکول بھی ان دارالعلوموں کے ماتحت ہوں اور اُنکی اجازت کے بغیر کوئی سکول نہ کھولا جائے ۔ اگر کچھ لائق آدمی ملکر

---

1. Universities

کیونکہ بچے جو کچھ اُن سکولوں میں سیکھتے ہیں وہ یا تو جلدی بھول جاتے ہیں۔ یا آگے جا کر وہ پڑھائی اُن کے کسی کام نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ تعلیم ہمارے گاؤں یا شہروں کے حالات کے مطابق نہیں ہوتی جو لوگ اس تعلیم کا خرچ دیتے ہیں یعنی ٹیکس وغیرہ دیتے ہیں اوّل تو اُنہیں ہی اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ تو بچوں کو بھلا کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟۔

ب۔ پرائمری تعلیم کا کورس سات سال کا ہونا چاہیئے اور اُس میں سوائے انگریزی کے وہ سب مضامین شامل کرنے چاہئیں جو اب انٹرنس پاس کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور ساتھ ہی کوئی نہ کوئی دستکاری بھی سکھلائی جانی چاہئے۔ جس سے طلبا روزی کما سکیں۔

ج۔ لڑکے اور لڑکیوں کی مکمل تربیت کے لئے کسی مفید دستکاری کی اشد ضرورت ہے۔ اور ایسا انتظام ہو۔ کہ ایک تو طالب علم اپنا خرچ اُسی دستکاری کے ذریعے سے نکال لے اور ساتھ ہی تعلیم اس کے (لڑکے اور لڑکی کے) قوا کو ایسی نشوو نما دے کہ بعد میں وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو سکے۔ اور جو سکول میں سیکھے وہ اُسکے کام آئے۔ طلبا کے کام کرنے سے جو آمدنی ہو اُسے سکول کی عمارت یا دیگر اخراجات سے کچھ واسطہ نہ ہو۔

مفصلہ ذیل دستکاریاں سکولوں میں جاری کی جا سکتی ہیں۔ جہاں بچے اُنہیں آسانی سے سیکھ سکتے ہیں وہاں اُن پر زیادہ سرمایہ خرچ

۱۴

تعلیم کے متعلّق تجاویز

("ہریجن" - ۲راکتوبر ۱۹۳۷ء)

گاندھی جی نے سرب ہند نیشنل یا قومی تعلیمی کانفرنس (جو وار دھا میں منعقد ہوئی تھی) کے سامنے مفصلہ ذیل تجاویز پیش کیں تا کہ کانفرنس اُن پر غور کرے :-

۱- موجودہ طریقۂ تعلیم ہمارے ملک کی ضروریات کو کسی طرح سے بھی پورا نہیں کرتا۔ چونکہ اعلیٰ تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دی جارہی ہے اس لئے چند تعلیم یافتہ اور بہت سے ان پڑھ لوگوں کے درمیان ایک مستقل خلیج حائل ہوگئی ہے۔ اور عوام علم سے محروم رہ جاتے ہیں - انگریزی زبان کو اہمیت دینے سے تعلیم یافتہ طبقے کے دماغ پر ایسا بوجھ پڑتا ہے کہ اُنکے دماغ بالکل ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ اور وہ اپنے ملک میں بیگانہ وار پھرتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ دستکاری نہ جاننے کی وجہ سے روٹی کمانے سے معذور ہیں اور اُنکی جسمانی صحت بھی خراب ہوگئی ہے۔ پرائمری تعلیم پر جو روپیہ خرچ ہوتا ہے وہ ایک طرح سے بالکل ضائع ہورہا ہے۔

بجوڈ نکالے۔ اور حقیقی تعلیم تو وہی ہے جو اِس معیار پر پُوری اُترے۔



ہے کہ وہ موجودہ طریقۂ تعلیم کے متعلق اپنے پہلے سے بنے ہوئے خیالات کو چھوڑ دیں۔ اور کسی قسم کے تعصب کو دل میں جگہ نہ دیں۔ وہ صاحب اس بات کا خیال نہ کریں کہ میں تعلیم کے اِصطلاحی یا اصولی پہلوؤں سے بالکل بے خبر ہوں اور اس وجہ سے جو کچھ میں اس کے متعلق کہتا یا لکھتا ہوں اُسے بہت اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ کہتے ہیں کہ انسان دانائی بعض دفعہ دُودھ پیتے بچوں سے سیکھتا ہے۔ شاید یہ بات کسی حد تک مبالغہ آمیز ہو۔ مگر اس میں کچھ سچائی بھی تو ضرور ہے۔ عقلمند لوگ اس پر حاشیہ آرائی کر لیتے ہیں۔ اور اُسے حقیقت کی شکل دے دیتے ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ آپ ان تجاویز کو زیر نظر رکھ کر بات کی تہ تک پہنچیں۔ میں اُن اصولوں کو پھر بیان کئے دیتا ہوں۔ پہلے بھی اسی اخبار میں وہ بیان کئے گئے تھے۔ مگر اب دوسرے الفاظ میں اُنہی کو دُہراتا ہوں۔ (عبارت ابھی لکھوا رہا ہوں)

(۱) پرائمری درجہ کی تعلیم جو سات سال یا کچھ زیادہ عرصہ تک دیجائے اُس میں سوائے انگریزی زبان کے وہ سب مضامین شامل ہوں جو اب امتحان انٹرنس تک پڑھائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک ایسی دستکاری ہو جس کے سیکھنے سے لڑکے اور لڑکیوں کے دماغ کا نشو و نما ہر پہلو سے ہو۔ موجودہ پرائمری۔ مڈل اور ہائی سکول کی تعلیم کی بجائے مذکورہ بالا طریقہ کا اجرا ہو۔

(ب) یہ تعلیم عملی طور پر ایسی ہو (اور ہو سکتی ہے) کہ اپنا خرچ خود

رام چندرن بڑے جوش سے بول اُٹھا۔ اگر کوئی شخص نہ کاتے تو اُسے کیونکر کہا جائے۔ کہ تم کانگرس کے ممبر نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے کہ ایسے شخص کسی اور طریق سے مُلک کی خدمت کر سکتے ہوں۔

گاندھی جی نے پوچھا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ ووٹ کے حق کے لئے بالیت کی شرط کیوں لگائی جاتی ہے۔ اور کیوں کوئی شخص جب کانگرس کا ممبر ہو تو چار آنے چندہ دے؟ پھر عمر کی شرط کس واسطے لگائی جاتی ہے؟ اگر کوئی بچہ آٹھ سال کی عمر میں عمدہ وائلن[1] بجانے لگے تو کیا اُلی بیں اُسے ووٹ دینے کا حق دے دیا جلئے گا؟ جان سٹورٹ مل[2] جب سات برس کا تھا تو یونانی اور لاطینی زبانیں خوب اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اور بڑا ہی لائق تھا۔ اُسے کیوں نہ ووٹ دینے کا حق دے دیا گیا؟ ایسی حالتوں میں ووٹ کا حق کیوں نہ دیا گیا؟ سب کو تو ووٹ کا حق نہیں دے دیا جانا۔ کچھ شرطیں لگانی پڑتی ہی ہیں۔ آج تو میری بات کوئی نہیں سُنتا۔ مگر مجھے پُورا یقین ہے اور وہ دن بھی دُور نہیں (شائد میرے مرنے کے بعد آئے) جب لوگ کہیں گے کہ بیشک گاندھی ٹھیک کہتا تھا۔

اُس وقت سات بج گئے تھے اور رام چندرن کی گاڑی بھی روانہ ہو چکی تھی۔ مگر اُسے بہت کچھ فائدہ ہُوا۔ اور اُس نے بہت کچھ سیکھا۔ دوسرے دن صبح چلنے سے پہلے اُس کی گاندھی جی سے پھر بات چیت ہوئی۔ گو یہ بڑی مختصر تھی مگر آخر اُس کی پُوری تسلی ہو گئی۔

---

[1] Violin [2] John Stuart Mill

سے بھی زیادہ خراب ہے۔ شرابی پھر بھی کچھ کام کرے گا۔ اُس کے سینے میں دل تو ہے اور وہ کچھ سمجھ رکھتا ہے۔ یہ بھوک کے مارے ہوئے آدمی تو بالکل کام کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اور جانوروں سے بھی بدتر تھے۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ اِس قسم کے لوگوں سے کیا کام لیا جاوے؟ مجھے تو کوئی اور علاج دکھلائی نہیں پڑتا۔ سوائے اس کے کہ اِن سے چرخہ کاتنے کو کہا جائے۔

بدیشی کپڑے کا ہر انچ جو ہمارے مُلک میں آتا ہے یوں سمجھو کہ ہمارے مُلک کے غریبوں کے منہ سے روٹی کا ٹکڑہ نکال لئے جاتا ہے۔ اگر تم بھی میری طرح اس وقت کی احتیاج کو محسوس کرو تو تمہیں بھی پتہ چلے۔ کہ ہندوستان کے لاکھوں آدمیوں کو اس وقت پیسہ کمانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ بچارے بھوکے مر رہے ہیں انہیں تو کھانے کے لئے روٹی چاہیئے۔ جو وہ خوشی سے بیٹھ کر کھائیں۔ اگر ایسا احساس ہوتا تو تم کبھی چرخہ کاتنے اور ووٹ کے حق کے برخلاف نہ ہوتے۔ کانگرس ایک ایسے مرد اور عورتوں کا مجمع ہے۔ کہ جو کاتنے کی ضرورت کو خوب جانتے ہیں۔ پھر ممبروں کے لئے کیوں کاتنا لازمی قرار نہ دیا جائے۔ پھر تم کہتے ہو۔ کہ ممبروں کو صرف تشویق کی جائے اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ کہ اُن سے کہا جائے۔ کہ بھائی تم باقاعدہ اِس قدر سُوت کات کر ہر مہینہ داخل کرو۔ بھلا جو خود نہ کاتتا ہو وہ دوسروں کو کیسے کہہ سکتا ہے کہ بھائی تم کاتو۔

نہ ہوگی؟ اگر کانگرس ایسا حکم دے تو تم معترض نہ ہوگے؟ یہ کیوں؟ اس لئے کہ شراب پینے کی خرابیاں ظاہر ہیں۔ اسی طرح سے میں بھی کہتا ہوں۔ کہ ہمارے ہندوستان میں لاکھوں آدمی بھوک سے مر رہے ہیں اور ہزاروں مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ایسی حالت میں پردیسی کپڑا باہر سے ہمارے ملک میں آنا بڑا ہی مُضر ہے۔ اڑیسہ میں لاکھوں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ جب میں وہاں گیا تو میں نے قحط زدہ لوگوں کو دیکھا۔

میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کی مہربانی سے ایک صنعتی گھر کو دیکھنے بھی چلا گیا۔ وہاں بچے بڑے خوش اور تر و تازہ معلوم دیتے تھے۔ وہ دریاں اور ٹوکریاں وغیرہ بنانے میں مشغول تھے۔ وہاں چرخہ تو نہیں کاتتے تھے۔ کیونکہ اُس وقت وہاں اس کا رواج نہ تھا۔ مگر اُنکے چہرے بشّاش تھے۔ اور وہ کام کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ پھر مجھے قحط زدہ مقاموں میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ اور میں نے وہاں دیکھا۔ کہ لوگوں کے جسم پنجر ہو رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اب مرے۔ اُن کی یہ حالت اس لئے ہو گئی تھی۔ کہ وہ بالکل کام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر اُن سے یہ کہا جاتا۔ کہ تم کام کرو ورنہ تمہیں گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ تو شائد وہ گولی کھانے کے لئے تیار ہو جاتے مگر کام نہ کرتے۔ یہ سُستی کی عادت تو شراب پینے کی عادت

Industrial Home

چرخہ کاتنا

رام چندرن کا آخری یا چوتھا سوال چرخہ کاتنے اور ووٹ کا حق حاصل کرنے کے متعلق تھا۔ شروع میں ہی رام چندرن نے مہاتما جی سے صاف عرض کر دیا تھا۔ کہ وہ خود تو برابر چرخہ کاتتا ہے۔ مگر اس نے اور اس کے شانتی نکیتن کے دوستوں نے کاتنا اس دن سے شروع کیا ہے جب انہوں نے آپ کے برت کی بابت سنا۔ رام چندرن نے یہ بھی کہا کہ سب کو چرخہ کاتنا چاہئے۔ مگر میری یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کانگرس اپنے ممبروں کو چرخہ کاتنے کیلئے مجبور کس طرح کر سکتی ہے۔ تشویق دے مگر مجبور تو نہ کرے۔

گاندھی جی نے کہا۔ اچھا! تم تو مسٹر اینڈریوز سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ وہ بھی کہتے تھے۔ کہ کانگرس ممبروں کو کاتنے کیلئے مجبور نہیں کر سکتی۔ مگر وہ خوشی سے کاتنے والی "ایسوسی ایشن"[1] کے ممبر بن گئے تھے۔ اور اس کے قاعدوں کی پابندی کرنے کے لئے تیار تھے۔

رام چندرن کچھ عرصے کے لئے چپ ہو گیا۔

تب گاندھی جی نے مدلل طریقے سے کہا۔ کہ میں تم سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کیا کانگرس کو کوئی حق حاصل ہے کہ اپنے ممبروں سے کہے تم شراب مت پیو؟ کیا ایسا حکم دینا انفرادی آزادی میں مداخلت

[1] Association

ورثہ چھوڑے؟

باپو جی نے کہا اور بڑے زور سے کہا۔ کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اُس کے شاگرد کافی ہیں۔ جو اُس کے بچوں سے کہیں زیادہ ہونگے۔ اور اُن شاگردوں کی معرفت وہ بخوبی اپنے عطیہ کو آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ سکتا ہے۔ ایسے شخص کے شاگرد اُس کی روحانی نسل ہوگی۔ اس قسم کی روحانی شادی تو بڑی ہی پھل دینے والی ہوئی۔ دنیاوی شادی کو رہنے دیجئے۔ ایسی شادیاں ہوتی رہیں گی۔ بچے تو ہوتے ہی رہیں گے۔ مگر اس سے انسانیت اُوپر کی طرف نہیں جا سکتی۔ خواہشاتِ نفسانی شادی میں پریل (زوردار) ہوتی جاتی ہیں

رام چندرن نے کہا۔ کہ مسٹر اینڈریوز بھی آپ کے اِس مجرّد رہنے کے خیال کو پسند نہیں کرتے۔

گاندھی جی نے کہا۔ کہ یہ تو میں جانتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ پروٹسٹنٹ[1] ہیں۔ اور پروٹسٹنٹ دھرم کی اَور باتیں تو بہت اچھی ہیں۔ مگر وہ لوگ مجرّدپن کی بڑی ہنسی اُڑاتے ہیں۔

رام چندرن نے جواب میں کہا۔ کہ اس کا بھی ایک سبب ہے۔ اُس زمانے کے پادری لوگ اخلاق میں بہت گر گئے تھے

باپو جی نے کہا۔ اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا۔ کہ مجرّدپن میں کچھ ذاتی خرابی ہے۔ سچ پوچھو تو کیتھولک[2] دھرم آج تک مجرّدپن کی وجہ سے ہی زندہ ہے۔

---

[1] Protestent

[2] Catholic

ہوگی۔ زندگی کا اصل مقصد تو موکھش یا نجات ہے۔ ایک ہندو ہونے کی حیثیت میں میں خیال کرتا ہوں۔ کہ موکھش کے معنی جنم مرن سے آزادی یا رہائی پانا ہے۔ اس کے لئے لذات نفسانی سے آزاد ہونا اور پرماتما سے مل جانا لازمی معلوم ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے شادی ایک طرح سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے دنیاوی تعلقات کو اور بھی مضبوط کر کے باندھ دیتی ہے۔ مجرد رہنے سے انسان کو حصول مقصد میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں وہ بالکل اپنے آپ کو ایشور کے حوالے کر سکتا ہے۔

شادی کا مقصد جو عام لوگ سمجھتے ہیں وہ تو یہی ہے کہ نسل بڑھے اور کس مطلب کیلئے لوگ شادی کرتے ہیں؟ آخر اولاد تو ضرور ہوگی اور بڑھے گی بھی۔

رام چندرن نے کہا تو پھر لوگوں کو مجرد رہنے کے لئے کہا جائے۔ اور یہ اُپدیش سب کو دیا جائے؟

جب گاندھی جی نے ہاں کہہ دیا تو رام چندرن بچارا بڑا حیران ہوا۔ تب گاندھی جی نے فوراً ہی کہا۔ کہ شائد تم اس بات سے ڈرتے ہو۔ کہ پھر دنیا ہی ختم ہو جائے گی۔ بالکل نہیں! انسان بالکل ختم نہیں ہو جائیگا بلکہ اُس کی حالت پہلے سے اُونچی ہو جائے گی۔

اس پر رام چندرن بول اُٹھا ایک صاحب فن مثلاً شاعر یا موجد کیوں نہ آنے والی نسلوں کے لئے اپنے بچوں کی شکل میں ایک

بناناہی رہیگا۔ اُس کی روزی برابر بنی رہے گی۔ مگر جب نکلہ ذرا ٹیڑھا ہوا۔ تو سُوت کاتنے والا اُس کل کے ذریعہ اُسے سیدھا کرے گا۔ الغرض لالچ کی جگہ محبت لے آؤ تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔

رام چندرن کی بظاہر اس بحث سے کچھ تسلی نہ ہوئی۔ اُس نے خیال کیا تھا۔ کہ مہاتما جی سب قسم کی کلوں کے برخلاف ہیں۔ اور اُسے اب یہ محسوس ہوا۔ کہ جو گاندھی جی کہتے تھے وہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ معاملے کو اچھی طرح سے سمجھنا چاہتا تھا۔ مگر وقت گذرتا جاتا تھا اور اس نے ابھی اور سوال بھی پوچھنے تھے۔ گاندھی جی نے مسکرا کر کہا۔ کہ ریل گاڑی کے چلے جانے کی پرواہ مت کرو۔ میں تمہاری پوری تشفی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جتنے سوال مرضی ہو کرو۔ میں جواب دینے سے نہیں تھکونگا

اُس نوجوان دوست کے پاس بھی بہت سے سوال باقی تھے۔ مہاتما گاندھی جی کا کہنا۔ کہ دل کھول کر سوال پوچھو۔ رام چندرن کے لئے بڑا حوصلہ بخش ثابت ہوا۔ اور اُس نے کمرِ ہمت باندھی۔ اور تیسرا سوال جو شادی کے متعلق تھا پوچھا۔

شادی

رام چندرن نے کہا۔ کہ تیسرا سوال جو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کیا آپ شادی کرنے کی رسم کے برخلاف ہیں؟

باپو جی نے جواب میں کہا۔ کہ مجھے اس سوال پر مفصل بحث کرنی

بابو جی نے مسکرا کر رام چندرن سے کہا۔ ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ اُنہوں نے دیکھا۔ کہ یہ نوجوان تو مخالفت پر اڑا ہے۔ کہنے لگے۔ کہ میں سوشلسٹ خیال کا ہوں۔ یہ سب کارخانے قومی حکومت کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں۔ اور ان کا مقصد صرف نفع کمانا ہی نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ کارخانے عوام کے فائدے کیلئے ہونے چاہئیں۔ اور ان میں جو لوگ کام کریں ان کیلئے ہر طرح کی آسائش اور آرام کا بندوبست ہونا چاہئے۔ یعنی ان کا محرک جذبہ اُلفت ہو نہ کہ حرص اور لالچ۔ میں تو چاہتا ہوں۔ کہ مزدوروں کی حالت بالکل بدل دی جاوے۔ دولت کے لئے دوڑ دھوپ بند ہونی چاہئے۔ اور ہر مزدور کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہئے کہ نہ صرف اس کے گذارے کیلئے اُسے مزدوری ہی ملے گی بلکہ اس کی محنت بھی پہلے سے ہلکی ہوگی۔ اُس حالت میں کلیں اس مزدور کے لئے بھی جو انہیں چلاتا ہے مفید ثابت ہونگی۔ اور حکومت اور سرمایہ داروں کیلئے بھی جو کلوں کے مالک ہیں۔ الغرض یہ جدوجہد بند ہو جائے گی اور مزدور آرام سے کام کرے گا اور ماحول بھی بہتر ہوگا۔

اور بھی اسی قسم کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ کپڑا سینے والی مشین محبت کے جذبہ کے زیر اثر ایجاد کی گئی۔ گویا انسان کی آسائش کا خیال پہلے کیا گیا۔ محنت کا کم کرنا اور بغیر کسی لالچ کے صرف بنی نوع انسان کے آرام کی خاطر ایک ایجاد کرنا۔ یہ ہے اصل منشا۔ مثلاً اگر کوئی شخص ٹیڑھے تکلوں کو سیدھا کرنے کی کل نکالے تو بڑا مبارک ہے۔ لوہار تو تکلے

کا باعث ہونگی۔ میرا مدعا کلوں کے ذریعے کام کو بند کرنا نہیں بلکہ اُن سے جو نقصان ہوتا ہے اُسے کم کرنا ہے۔

رام چندرن کہنے لگا۔ کہ اگر یہی دلیل ہے تو اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ یہ سب کلیں جو بھاپ۔ بجلی اور تیلی وغیرہ سے کام کرتی ہیں ایک دن بالکل بند ہو جائیں گی۔

گاندھی جی مان گئے۔ کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ اور کہنے لگے۔ کہ ایک بات میں صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ضروری چیز تو انسان ہے۔ کلوں کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ انسان کو بالکل نکما اور بیکار بنا دیں مثلاً میں سمجھ سوچ کر کچھ کلوں کو مستثنٰے کر دوں گا۔ سنگر کی سینے والی مشین کو لیجئے۔ یہ ایک نہایت ہی مفید ایجاد ہے۔ اور اس ایجاد کا تو عجیب ماجرا ہے۔ سنگر نے ایک دن دیکھا۔ کہ اُس کی بیوی سوئی دھاگہ لیکر آہستہ آہستہ کچھ سی رہی ہے۔ چونکہ وہ بیوی سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس لئے اُس کی خاطر اُس نے یہ مشین ایجاد کی۔ تاکہ اُسے اتنی محنت نہ کرنی پڑے۔ ایسا کرنے سے اُس نے صرف اپنی بیوی کی محنت نہ بچائی بلکہ اوروں کی بھی۔ یعنی اُن سب کی بھی جو اُس مشین کو خرید سکتے تھے۔

تب رام چندرن جی بولے مگر ویسی کلیں بھی تو کسی کارخانے ہی میں بن سکتی ہیں۔ اُن کلوں کے چلانے کے لئے بھی تو بھاپ بجلی وغیرہ کا استعمال کرنا پڑے گا۔

رام چندرن کے اس سوال پر گاندھی جی ذرا مسکرائے اور بولے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو جانتا ہوں کہ یہ ہمارا جسم بھی ایک قسم کی بڑی نازک کل ہے۔ چرخہ بھی تو ایک کل ہی ہے۔ میرا اعتراض کلوں پر نہیں۔ بلکہ کلوں پر بالکل لٹو ہو جانے پر ہے۔ ایسی کلیں جو مزدوروں کو کام سے محروم کر دیتی ہیں اچھی نہیں۔ ہزاروں مزدور بے روزگار ہو جاتے ہیں اور گلی کوچوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور بھوکے مرتے ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ کثرت سے لوگ فارغ البال ہوں۔ نہ کہ تھوڑے سے۔ دولت کیوں چیدہ چیدہ ہاتھوں میں جمع ہوتی جائے۔ کیوں نہ سب کے پاس بٹ کر جاوے۔ آجکل کلوں نے تھوڑوں کو تو امیر بنا دیا ہے اور باقی لاکھوں بھوکے مرتے ہیں۔ کلوں کے مالک تو دولت کمانے کے لالچ سے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اُن کی غرض مزدوروں کو آرام دینے کی نہیں ہوتی۔ میں اس قسم کے اقتصادی نظام کے برخلاف ہوں۔ اور اس کی تائید نہیں کرتا۔

رام چندرن نے بڑے جوش سے کہا۔ کہ باپو جی! گویا آپ کلوں کے برخلاف نہیں بلکہ اُن کے خراب استعمال کے خلاف جنگ کر رہے ہیں

گاندھی جی نے بلا تامل کہہ دیا جی ہاں۔ ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ سائنس کی نئی نئی ایجادات اور اصولوں کے ذریعے دولت کمانا بالکل بند ہونا چاہیئے۔ تب ہی مزدوروں کو کچھ آرام مل سکے گا۔ اور کلیں بجائے ایک زحمت ہونے کے مزدوروں کیلئے رحمت

ہیں۔ جہاں ہماری آتما پرواز کرتی کرتی کہیں جگہ رُک جاتی ہے۔ سمجھو کہ وہاں وہم اور گمان رُونما ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہمارا جسم ہماری مُکتی اور نجات کے راستہ میں ایک رُکاوٹ بن جاتا ہے۔

رام چندرن بول اُٹھا۔ کہ میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں۔ کہ آپ نے فن پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اب میں سمجھ گیا ہوں اور اُنکو قبول کرتا ہوں۔ کیا آپ نوجوان نسلوں کے لیئے ان خیالات کو قلمبند کرنے کی تکلیف کریں گے؟ تاکہ اُن کی رہنمائی ہو۔ اور وہ مُستفید ہو سکیں۔

گاندھی جی نے مُسکرا کر جواب دیا اور کہا۔ کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا فن کے مضمون پر کچھ لکھنا گستاخی میں شامل ہوگا۔ میں نے اُس کا مطالعہ نہیں کیا۔ ہاں کچھ بنیادی اصول جانتا ہوں۔ مگر اُن کے متعلق کچھ کہنا یا لکھنا مناسب نہیں۔ مجھے اپنی خامیوں کا خوب احساس ہے۔ اور اسی میں میری طاقت کا راز مخفی ہے۔ جو کچھ بھی میں نے اپنی زندگی میں کیا ہے وہ اسی لیئے۔ کہ میں کبھی اپنی حدود سے باہر نہیں جاتا تھا۔ صاحب فن کا اور کام ہے اور میرا کام اَور ہے۔ میں کیوں دوسروں کی حدود میں مداخلت کروں؟

کلیں

رام چندرن اب دوسرے سوال کی طرف متوجہ ہُوا۔ باپو جی! کیا آپ سب قسم کی کلوں کے برخلاف ہیں؟

اُن لوگوں نے جن کی ذاتی زندگی بڑی مکروہ تھی۔ بڑی بڑی خوبصورت چیزیں بنائی ہیں۔

گاندھی جی نے جواب میں کہا۔ اس کے تو صرف یہ معنی ہیں۔ کہ سچائی اور جھوٹ دونو ساتھ رہ سکتے ہیں۔ نیکی اور بدی اکثر باہم پائی جاتی ہیں۔ حقیقی خوبصورتی تو وہیں پائی جاتی ہے جہاں اندر کے جذبات صحیح ہوتے ہیں۔ اگر یہ مواقع زندگی میں کمیاب ہیں تو فن میں بھی شاذونادر ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اس پر رام چندرن کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اور دل میں کہنے لگا کہ اگر صرف سچی اور نیک چیزیں ہی خوبصورت ہوسکتی ہیں۔ تو جہاں نیکی نہیں وہاں خوبصورتی کیسے ہوسکتی ہے؟ پھر اُس نے باپو جی سے پوچھا کہ جو چیزیں دراصل نہ اچھی ہیں نہ بُری کیا اُن میں سچائی ہوسکتی ہے؟ مثلاً سورج کے غروب ہونے کا نظارہ۔ یا پہلی رات کا چاند جو رات کے وقت چمکتے ہوئے ستاروں میں نکلتا ہے!

گاندھی جی نے جواب میں کہا۔ کہ بے شک یہ منظر حقیقی ہیں۔ کیونکہ اُنکی پُشت پر ایک خالقِ مطلق ہے جس کا ہمیں خیال آجاتا ہے جب خلقت کے اندر حقیقت مخفی ہے تو پھر وہاں خوبصورتی کیوں نہ ہو۔ جب میں ایسے منظر دیکھتا ہوں تو میری آتما اُس خالق کے آگے سربسجود ہوجاتی ہے۔ میں اُس خالق کے فیوضات کو اُس کی مخلوق میں مانتا ہوں۔ مگر ایسے منظر بھی اگر اُن میں اُس خالق کا خیال نہ ہو تو رکاوٹ بن جاتے

عورت کا چال چلن کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو؟

اس پر رام چندرن ذرا خاموش سا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ اُس حالت میں اُس عورت کا چہرہ خولصبورت نہیں ہو سکتا۔ چہرہ تو اندر کی آتما کو مُنعکس کرتا ہے۔ سچا صاحب فن جو سمجھ رکھتا ہو گا وہ اندرونی جذبات کو چہرے میں دکھلائے گا۔

گاندھی جی نے جواب میں کہا بھائی تم تو سوال کے گرد گرد گھوم رہے ہو۔ تم یہ مانتے ہو۔ کہ بیرونی شکل کی خولصبورتی کوئی معیار نہیں۔ حقیقی صاحب فن کے لئے تو صرف وہ چہرہ خولصبورت ہو گا (صرف بیرونی لحاظ سے نہیں) جس میں آتما یا اندرونی حقیقت جلوہ نما ہو گی۔ اس لئے خولصبورتی اور سچائی (حقیقت) دو چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز ہے۔ بلکہ حقیقت تو کبھی دفعہ ایسی شکلوں میں بھی ظاہر ہوتی ہے جو ظاہرہ طور پر بالکل خولصبورت نہ ہوں۔ مثلاً سقراط اپنے زمانے میں ایک نہایت ہی سچا شخص تھا۔ مگر وہ شکل وصورت میں سارے یونان میں بدصورت گنا جاتا تھا۔ میرے خیال میں تو وہ خولصبورت تھا۔ کیونکہ وہ ساری عمر سچائی یا حقیقت کی تلاش میں رہا۔ اور آپ کو یہ بھی یاد ہو گا۔ کہ اگرچہ سقراط بدشکل تھا۔ مگر فدیاس اُس کی سچائی کی بڑی قدر کرتا تھا یہ شخص فدیاس تو صاحبِ فن تھا۔ اور بیرونی وضع میں خولصبورتی دیکھنے کا عادی تھا۔

رام چندرن اب بڑی سرگرمی سے بول اُٹھا باپو جی! بعض دفعہ

ہیں کہ وہ بیرونی خوبصورتی میں حقیقت کو دیکھتے ہیں۔ کیا اُن کا یہ خیال درست ہے؟

گاندھی جی نے فوراً ہی جواب میں کہا۔ کہ اس کے برعکس ہونا چاہیئے۔ میں تو حقیقت میں یا اُس کے ذریعے خوبصورتی دیکھتا ہوں۔ دراصل جہاں بھی سچائی یا حقیقت ہوگی۔ وہاں خوبصورتی بھی ہوگی۔ سچا خیال ہی نہیں بلکہ ایک سچا چہرہ یا ایک سچی تصویر یا ایک سچا گیت سب کے سب نہایت ہی خوبصورت ہونگے۔ لوگ حقیقت یا سچائی میں خوبصورتی نہیں دیکھتے۔ معمولی انسان تو اُس سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ جب لوگ حقیقت یا سچائی میں خوبصورتی دیکھیں گے تب ہی حقیقی فن اُن کی سمجھ میں آئے گا۔

تب رام چندرن نے پوچھا کیا خوبصورتی حقیقت سے یا حقیقت خوبصورتی سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی؟

گاندھی جی نے جواب میں کہا۔ پہلے مجھے یہ تو بتلائیے۔ کہ خوبصورتی ہے کیا چیز؟ اگر خوبصورتی کے وہی معنے ہیں جو عام لوگ سمجھتے ہیں۔ تو اس میں بہت اختلاف ہے۔ کیا ایک خوبصورت خدوخال والی عورت واقعی خوبصورت ہوتی ہے؟

رام چندرن نے بغیر سوچے سمجھے ہی کہہ دیا۔ کہ ہاں خوبصورت ہوتی ہے۔

مہاتما گاندھی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہ چاہے اُس

آسکر وائلڈ موجودہ زمانے کے مشہور صاحبِ فن ہو گذرے ہیں۔

مہاتما جی نے کہا۔ یہی تو میری مشکل ہے۔ بلاشبہ فن کی بیرونی وضع کے لحاظ سے تو آسکر وائلڈ مشاہیر میں سے گِنا جا سکتا ہے۔ اور بد اخلاقی کو خوبصورت بنا کر دکھانا اُسی کا کام تھا۔ مگر بات تو یہ ہے۔ کہ حقیقی فن سے ہمارے آتما کا وکاش (ترقی) مقصود ہے۔ جس سے ہم اپنے آپ کو پہچاننے کے قابل ہوتے ہیں۔ میں تو اس احساس کے لئے کسی بیرونی وضع کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس لئے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ میری زندگی میں اصلی یا حقیقی فن کافی طور پر موجود ہے۔ چاہے بیرونی شکل میں وہ فن میرے اِرد گرد نہ ہو۔ اگر میرے کمروں کی دیواروں پر کوئی تصویر آویزاں نہ ہو تو کیا مضائقہ بلکہ چھت بھی سر پر نہ ہو تو اچھا ہے۔ تاکہ میں ستیاروں بھرے آسمان کے خوبصورت منظر کو دیکھتا رہوں بھلا آپ ہی بتلائیے۔ کہ کونسا صاحبِ فن ایسے منظر کو میرے سامنے لا سکتا ہے؟ اس سے میری یہ مراد نہیں۔ کہ اہلِ فن نے جو شاہکار تیار کئے ہیں اُن کی میں قدر نہیں کرتا۔ مگر میرا یہ ذاتی احساس ہے کہ قدرت کے نظاروں کے سامنے وہ شاہکار کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ انسانی ہاتھ کی بنائی ہوئی اشیاء اُس حد تک ہی قابلِ قدر ہیں جب کہ وہ انسان کی اندرونی زندگی کو نشو و نما کریں۔ اور اُسے انبھو (احساس) میں مدد دیں۔

رام چندرن نے کہا۔ کہ اہلِ فن تو اس بات کا بھی دعوےٰ کرتے

کے متعلق لوگوں کے دلوں میں کچھ غلط فہمی سی ہو گئی ہے۔ اس سوال کے دو پہلو ہیں۔ ایک بیرونی اور دوسرا اندرونی۔ بات یہ ہے کہ کس پہلو پر زیادہ زور دیا جائے۔ بیرونی پہلو جب تک اندرونی پہلو کی مدد نہ کرے بیکار ہے۔ حقیقی فن تو وہ ہے جو اندر کی آتما (روح) کا وکاش (ترقی) کرے۔ بیرونی وضاعت (وضع) اُس حد تک قیمتی خیال کی جا سکتی ہے کہ اُس سے انسان کی اندر کی آتما کا پرکاش (ظہور) ہو۔

رام چندرن نے ذرا تامل کرتے ہوئے کہا اہلِ فن تو خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ حقیقی فن اندر کے اندولن (تحریک) کا الفاظ۔ الوان اور مختلف اشکال میں ظاہر کرنے کا نام ہے۔

تب گاندھی جی نے کہا۔ کہ ہاں بالکل درست ہے۔ اِس قسم کا حقیقی فن مجھے بھی بہت پسند ہے۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ کہ بہت سے لوگ جو صاحبِ فن کہلاتے ہیں یا مانے جاتے ہیں اُن کے فن میں اِس اندرونی اندولن کی جھلک تک بھی نہیں ہوتی۔

رام چندرن نے تب مہاتما جی سے کہا۔ کہ کیا آپ اس کی کوئی مثال پیش کر سکتے ہیں؟

مہاتما جی نے کہا کہ ہاں۔ آسکر وائلڈ کو لیجیے۔ اُن کے متعلق میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔ کیونکہ جب اُن کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں تو اُس وقت میں انگلستان میں موجود تھا۔

اتنے میں رام چندرن بول اٹھا۔ کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے

دوسرے دن سوموار تھا۔ اور مہاتماجی کی خاموشی کا دن تھا۔ اس لئے رام چندرن ایک دن اور ٹھہر گیا۔ منگل کے دن صبح ہی اُسے کلکتہ کی گاڑی پر سوار ہونا تھا۔ صبح سویرے ہی کوئی ساڑھے پانچ بجے پرار تھنا کے بعد مہاتماجی نے رام چندرن کو بُلایا۔ اس طالب علم نے اپنے سوالات اور شکوک اور مشکلات ٹھیک ٹھاک کر کے تیار کر لئے تھے۔ مگر اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہ اپنا سب دل کھول کر مہاتماجی کے آگے رکھ دے۔ آخر اُس نے بڑی دلیری کی۔ اور یہ دیکھ کر حیران ہوا۔ کہ مہاتماجی نے بڑے پیار سے اُس سے اُس کے گھر اور پڑھائی کے متعلق دریافت کیا۔ پھر تو اُسے اور بھی حوصلہ ہو گیا۔ اور کوئی ڈر یا تسدیش باقی نہ رہا۔

جو گفتگو مہاتماجی اور رام چندرن کے درمیان اُس صبح ہوئی اُسکو تفصیل سے بیان کرنا تو ناممکن ہے۔ مگر خلاصہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

رام چندرن نے دورانِ گفتگو میں پوچھا۔ کہ مہاتماجی! اس کا کیا سبب ہے۔ کہ بہت سے عقلمند اور برجستہ شخص جو آپ کے مدّاح ہیں اور آپ سے پیار بھی کرتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ آپ نے دانستہ یا نادانستہ قومی زندگی کو سرجیت کرنیکی تدبیروں میں فن کو بہت اہمیت نہیں دی ہے؟

مہاتماجی نے جواب میں فرمایا۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ اس معاملے

۱

ایک طالب علم کے چار سوال

("ینگ انڈیا" ۱۳ر نومبر ۱۹۲۴ء)

اُن دنوں جب مہاتما جی تپسیا اور پرارتھنا میں لگے ہوئے تھے۔ جو لوگ "دل افروز" بنگلے میں ملاقات کے لئے جاتے۔ اُن میں ایک نوجوان طالب علم بھی تھا۔ جو شانتی نکیتن سے آیا تھا۔ اور جس کا نام رام چندرن تھا۔ یہ طالب علم مسٹر اینڈریوز کا شاگرد تھا۔ اور اُس نے اپنے اُستاد سے دلّی میں کچھ دن قیام کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی جس شام کو مسٹر اینڈریوز دلّی سے جانے والے تھے۔ وہ رام چندرن کو مہاتما جی کے پاس لے گئے۔ مہاتما جی اُوپر والی چھت میں رہتے تھے مسٹر اینڈریوز نے مہاتما گاندھی جی سے کہا۔ کہ میں نے رام چندرن کا ابھی تک آپ سے تعارف نہیں کرایا۔ یہ نوجوان ہمارے ساتھ ہی رہا ہے اور ہم کو ہر طرح سے مدد دیتا رہا ہے۔ وہ آپ سے کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ کل وہ واپس شانتی نکیتن چلا جائے گا۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر آپ اُس کی روانگی سے پہلے اُس سے بات چیت کر لیں



فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ



مهاتما گاندهی

تمہید

یہ کتاب کانگریس کی گولڈن جوبلی (پچاس سالہ تقریب) کے موقع
پر پہلی بار شائع کی گئی تھی۔ اس میں جو کچھ مہاتما جی نے طلبا کے متعلق
۱۹۲۸ء تک فرمایا تھا "ینگ انڈیا" سے لیکر درج کیا گیا۔ اور ان مضامین
کو مسٹر منگورانی صاحب نے بڑی محنت سے جمع کر کے شائع کیا تھا۔
یہ کتاب پہلی بار دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ اب، دوبارہ اکتوبر ۱۹۳۸ء
میں شائع ہوتی ہے۔ ۱۹۳۰ء سے لیکر ۱۹۳۸ء تک جو مضامین تعلیم یا
طلبا کے متعلق "ینگ انڈیا" یا "ہریجن" میں شائع ہوئے ہیں وہ سب اس
کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ گویا طلبا کے متعلق گزشتہ اٹھارہ سال
میں جو کچھ بھی مہاتما گاندھی جی نے فرمایا ہے وہ اس کتاب میں درج ہے
اس میں ایک فصل واردھا سکیم پر بھی ہے جو نہایت ہی دلچسپ ہے
امید ہے کہ طلبا اور دیگر تعلیم یافتہ لوگ اس کتاب کے پڑھنے سے
فائدہ اٹھائیں گے۔ ترجمہ نہایت سلیس اور آسان ہندوستانی میں
کیا گیا ہے۔ اور یہی کوشش کی گئی ہے کہ عام فہم ہو۔

مترجم

مہاتما گاندھی کا پیغام

طالب علموں کے نام

مؤلفہ

عالیجناب آنند ڈی ہینگورانی صاحب کراچی

مترجمہ

پروفیسر پریتم سنگھ صاحب ایم۔اے لاہور

قیمت ــــ عہ

پہلی بار ــــ ایک ہزار